www.shibliinternational.com

June 2020

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

Issue28 شمارہ_Vol:3 جلد

June :2020 جون

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202 Bank: SBI
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

Email: sadaeshibli@gmail.com

خط و کتابت کا پتہ

Mob: 9392533661 - 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۵)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۱
۵	نبی کریمؐ انسانی مساوات کے سب سے بڑے علمبردار	احمد نور عینی	۱۳
۶	غزل	سردار سلیم	۱۹
۷	امجد حیدر آبادی اور ڈاکٹر زور توافق وتناقص	جی بی عائشہ	۲۰
۸	آزادی کے بعد ادب اطفال میں خواتین ہند کی خدمات	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۲۳
۹	غزل	معین افروز	۳۰
۱۰	عربی اور مغربی ادب میں ادب اطفال کا مختصر جائزہ	محمد ارشاد عالم	۳۱
۱۱	جیلانی بانو کی فکشن نگاری	عابد حسین گنائی	۳۵
۱۲	رہبر	افشان جبین	۴۱

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغاپورہ حیدرآباد

ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد

علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)

الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد

جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج

چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔

الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

اس وقت تقریباً پوری دنیا خصوصاً ہمارا ملک کرونا وائرس کے خوفناک رفتار سے پھیلاؤ کی وجہ سے ہل رہا ہے۔ پیشہ سے انصاف کرنے والوں ڈاکٹروں کی سرتوڑ کوششیں بھی اس مرض کو روکنے میں ناکام ہوگئیں ہیں۔ ہر نیا دن متاثرہ افراد کی تعداد میں اضافے کی بُری اور دل دہلا دینے والی خبر لے کر آتا ہے۔ مریضوں کے علاج کرنے والے خود مریض بن گئے اور لقمۂ اجل بن کر رہ گئے، اموات کی کثرت نے عوام کو خوف وہیبت میں ڈال دیا ہے۔ اس مرض کی تشخیص کے بعد اپنے اور پرائے مریض کی زندگی سے اور مرنے کے بعد بھی دور بھاگنے لگے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں ہر کس وناکس کو چاہئے کہ گورنمنٹ میں ہو یا اپوزیشن یا پھر پبلک ہر ایک کو اپنی اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنے کی ضرورت ہے۔ اس بیماری کو یا سازش کو حوصلے اور احتیاط وعلاج کے ذریعہ مات دیا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ ارحم الراحمین نے ہر بیماری کے لیے شفا کا پاؤڈر دنیا میں رکھا ہے، بس ہمیں اس تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔

کرونا سے تقریباً پوری دنیا پریشان ہے مگر ہمارا ملک اپنے پڑوسیوں سے غلط پالیسیوں کی وجہ سے دشمنی مول لے رکھا ہے۔ یہ ملک کے داخلی اور خارجی سطح پر کمزور ہونے کی پالیسی ہے، جس کا خمیازہ ہمارے ملک کو ہر شعبہ حیات میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ملک کے بیس جانباز جوان سپوت چین کی فوجیوں کے گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ ادارہ ان جانبازوں کی شہادت کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور ان کے پسماندگان کی خدمت میں تعزیت پیش کرتا ہے۔

حالاتِ حاضرہ کو مدنظر رکھتے ہوئے تقریباً ہر زبان میں بالخصوص اردو ادباء وشعراء اپنے مضامین، اشعار، غزلیں اور نظموں کی باڑھ لگادی۔ اس میں غیر معمولی تنوع اور قوت تخلیق کا اظہار موجود ہے جو الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ قارئین تک پہنچا، جس میں عوام کی بدحالی اور حکومت کی ناکامی کا بین ثبوت موجود ہے، اگر ان تمام تخلیقات کو کوئی باذوق اکٹھا کردے تو اردو زبان وادب میں ایک اہم اضافہ شمار ہوگا۔

اس مہاماری میں ہم سے بہت سے ملک وملت کے بے لوث خادم جدا ہوگئے۔ انہیں میں حیدرآباد کی دو مشہور شخصیات حضرت مولانا قاضی اعظم علی صوفی اور مولانا نصیرالدین صاحب ہیں۔ ادارہ ان کی ملی وسماجی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتا ہے اور بارگاہ ایزدی میں رفع درجات کی دعا کرتا ہے۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

عدل وانصاف:

طارق محاربی کا بیان ہے کہ جب اسلام عرب میں پھیلنا شروع ہوا تو ہم چند آدمی ربذہ سے نکلے اور مدینہ کو روانہ ہوئے، شہر کے قریب پہنچ کر مقام کیا، زنانی سواری بھی ساتھ تھی، ہم سب بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب سفید کپڑے پہنے ہوئے آئے اور سلام علیک کی، ہم نے سلام کا جواب دیا، ہمارے ساتھ سرخ رنگ کا اونٹ تھا، اس کی قیمت پوچھی، ہم نے جواب دیا، اتنی کھجوریں، انہوں نے کچھ مول تول نہیں کیا اور وہی قیمت منظور کرلی، پھر اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف بڑھے، نظروں سے اوجھل ہوئے تو سب کو خیال آیا کہ دام رہ گئے اور ہم لوگ ان کو پہچانتے نہیں، لوگوں نے ایک دوسرے کو ملزم ٹھہرانا شروع کیا، محمل نشین خاتون نے کہا مطمئن رہو، ہم نے کسی شخص کا چہرہ اس قدر چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن نہیں دیکھا (یعنی ایسا شخص دغا نہ کرے گا) رات ہوئی تو ایک شخص آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہارے لیے کھانا اور کھجوریں بھیجی ہیں، دوسرے دن صبح کو ہم لوگ مدینہ میں آئے، آنحضرت ﷺ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے، ہم لوگوں کو دیکھ کر ایک انصاری نے اٹھ کر کہا ''یارسول اللہ! یہ لوگ بنوثعلبہ کے قبیلہ کے ہیں اور ان کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک شخص کو قتل کردیا تھا، اس کے بدلہ میں ان کا ایک آدمی قتل کرادیجئے، آپؐ نے فرمایا ''باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جاسکتا''۔

سرقؓ ایک صحابی تھے، جن پر ایک یہودی کا قرض آتا تھا اور ان کے پاس بدن پر جو کپڑے تھے، ان کے سوا کچھ نہ تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب آنحضرت ﷺ خیبر کی مہم کا ارادہ کررہے تھے، ابوحدردؓ نے یہودی سے کچھ مہلت طلب کی لیکن وہ نہ مانا اور ان کو پکڑ کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا، آپؐ نے فرمایا کہ ان کا قرض ادا کرو، انہوں نے عذر کیا، آپؐ نے پھر فرمایا، انہوں نے پھر یہی جواب دیا اور عرض کی کہ یارسول اللہ! غزوۂ خیبر قریب ہے، شاید وہاں سے واپسی پر کچھ ہاتھ آئے تو میں اس کو ادا کردوں، آپؐ نے پھر یہی حکم دیا کہ فوراً ادا کردو، آخر اپنا تہبند اس یہودی کو قرض میں نذر کیا اور سر سے جو عمامہ بندھا تھا، اس کو کھول کر کمر سے لپیٹ لیا۔

اس عدل وانصاف کا یہ اثر تھا کہ مسلمان ایک طرف، یہودی بھی جو آپؐ کے شدید ترین دشمن تھے، اپنے مقدمات اسی بارگاہِ عدالت میں لاتے تھے اور ان کی شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ ہوتا تھا، چنانچہ قرآن مجید میں اس واقعہ کا مصرح ذکر ہے، اسلام سے پہلے یہودیانِ بنونضیرہ قریظہ میں عزت وشرافت کی عجیب وغریب حد قائم تھی، کوئی قریظی اگر کسی نضیری کو قتل کرتا تو قصاص میں وہ مارا جاتا لیکن اگر کوئی قریظی کسی نضیری کے ہاتھ سے مارا جاتا تو اس کے خون کی قیمت سو بار شتر چھوہارا تھی، اسلام میں جب یہ واقعہ پیش آیا تو قریظہ نے آکر آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش کیا، آپؐ نے فوراً توراۃ کے مطابق النفس بالنفس کے حکم سے دونوں قبیلوں میں برابر کا قصاص جاری کردیا۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی

پروفیسر ظہیر احمد صدیقی (۱۹۲۸۔۲۰۰۳ء) سابق استاذ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ڈاکٹر سید محمد ہاشم استاذ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ممتحن تھے، چنانچہ جب ہاشم صاحب نے پی ایچ ڈی کا مقالہ ''سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے'' ۱۹۹۵ء میں شائع کیا تو پروفیسر ظہیر احمد صدیقی نے اس پر پیش لفظ لکھا، اگرچہ یہ پیش لفظ مولانا سید سلیمان ندوی سے متعلق ہے مگر انھوں نے اس کا آغاز اس طرح کیا ہے:

''دبستان سرسید نے دو نامور فرزندوں کو پیدا کیا، حالی اور شبلی، دونوں کی شناخت ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ہے اور ناقد کی حیثیت سے بھی۔ حالی ایک ادبی نقاد تھے تو شبلی اس کے ساتھ ساتھ ادبی مورخ بھی تھے۔ حالی نے اردو تنقید کی خشت اول رکھی، اس کے باوجود ان کی تنقید کا سلسلہ مولوی عبدالحق پر آکر رک جاتا ہے جب کہ شبلی کی تنقید کا سلسلہ آج بھی اسی طرح جاری ہے''۔ (سید سلیمان ندوی حیات اور ادبی کارنامے ص ۷)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ہندوستان میں ملت اسلامیہ کی آبرو مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (پ:۱۹۲۹ء) ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ سے زیادہ عظمت شبلی سے کون واقف ہوسکتا ہے، وہ اس ادارے کے سربراہ ہیں جس کے لئے علامہ شبلی نے اپنا تمام سرمایہ زندگی نچھاور کردیا تھا، وہ علامہ شبلی کی عظمت، فہم وشعور جد وجہد اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لئے فکرمندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی نعمانی برصغیر پاک وہند کی ایک غیر معمولی شخصیت تھے۔ ان کی اہم ترین خصوصیات میں ملت اسلامیہ کی موجودہ پس ماندگی، ملت کے شاندار ماضی کی یاد اور اس کی بحالی کے لئے کچھ نہ کچھ کر ڈالنے کا جذبہ اور زمانہ کے قدیم وجدید کے درمیان ایک متوازن ربط پیدا کرنے کی خواہش موجزن تھی، جس کو انھوں نے اپنے مؤثر اور بلیغ شعر ونثر میں ظاہر کیا ہے۔

ان کی ساری تصانیف اور ساری منظومات اس کی آئینہ دار ہیں کہ وہ ایک طرف علم وہنر کے میدان میں یورپ کی ترقی اور طاقت وسیاست میں ان کی برتری کو اس کی پوری آن بان کی حالت میں دیکھ رہے تھے۔ اور دوسری طرف وہ مسلمانوں کے عروج کے عہد کی اپنی خوبی کے ساتھ دنیاوی سربلندی کی تاریخ سے کما حقہ واقف ہونے کے ساتھ ان کی ترقی کے عہد کے بعد ان کی موجودہ پستی اور تمدنی سطح پر ان کی بے بضاعتی اور علمی کم مائیگی اور سیاست وطاقت میں پسماندگی کو دیکھ رہے تھے، پھر اس پر مستزاد یورپین اہل علم کی ان علمی کاوشوں کو بھی دیکھ رہے تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کو بگاڑ کر پیش کرنے کو اپنا وطیرہ بنائے ہوئے تھے۔

(مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی، مقدمہ ص ۵)

علامہ شبلی تحریک ندوہ سے کیوں وابستہ ہوئے اور ان کے عزائم کیا تھے، مولانا مدظلہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حالات کے صحیح احساس وشعور نے علامہ کو ایک طرف مسلمانوں کو چشم بصیرت وا کرنے کی طرف متوجہ کیا اور اس کے لئے انھوں نے اپنی ادبی وعلمی صلاحیتوں کو صرف کرنے پر آمادہ کیا اور یہی احساس وشعور تھا جس نے ان کو علی گڑھ سے نکل کر ندوہ کی تحریک کو اپنا نصب العین بنا لینے اور اس کے لئے اپنے وقت کو صرف کرنے پر لگا دیا، تا کہ مسلمانوں کے لئے جامع تعلیم کی ایک ایسی صورت بن سکے، جس سے مسلمانوں کے ماضی کے اعلی سرمایہ علمی کے ساتھ جدید علمی ترقی کی صلاحیت کے آدمی تیار ہوسکیں۔ علامہ شبلی نے مسلمانوں کے جامع تعلیمی منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے جس فکر مندی اور عملی کاوش سے کام لیا، اس نے اس میدان کار میں خاصا اثر پیدا کیا اور فائدہ پہونچایا اور اس راہ میں ان کے متعدد غیر معمولی صلاحیت کے شاگرد تیار ہوئے جنھوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا اور کام انجام دیا''۔(ایضا)

علامہ شبلی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قوم کو پستی سے نکالنے کے لئے ان کے شاندار ماضی کی داستان سنائی، مولانا اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

دوسری طرف علامہ نے اپنی تصنیفات اور منظومات سے علم قدیم وعلم جدید کے حلقوں کو بھی قیمتی سرمایہ مہیا کیا، خاص طور پر تاریخ کے راستہ سے انھوں نے مسلمانوں کے ماضی کی سربلندی اور ان علوم میں ان کی جدت ومہارت جس میں انھوں نے دنیا کی اعلی تعلیم کی قوم کی حیثیت سے کئی صدیوں تک نام پیدا کیا، جب کہ یورپ کی قومیں نہایت علمی وتمدنی پستی کی حالت میں تھیں، مولانا نے اپنے تحقیقی کاموں کے ذریعہ مسلمانوں کی اس برتری کا تعارف کرایا اور اس طریقہ سے مسلمانوں میں مغرب کی ترقی وتفوق کو دیکھ دیکھ کر جو احساس کمتری اور پست ہمتی پیدا ہو رہی تھی اس کا خاصا ازالہ کیا۔(ایضاص ۶)

مولانا مدظلہ کا خیال ہے کہ یہی کام انھوں نے اپنی تصنیفات اور تحقیقات کے ذریعہ بھی انجام دیا، وہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے مغربی مصنفین کی تحریروں کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں پیدا کی گئی تھیں یا کی جارہی تھیں ان کا عالمانہ طریقہ سے ابطال کیا، کتب خانہ اسکندریہ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی علم دوستی کو جو مجروح کیا گیا تھا اس کی حقیقت واشگاف کی، ان باتوں کا یہ غیر معمولی اثر پڑا کہ کالج میں پڑھنے والے مسلم طلبہ کے پژمردہ دلوں میں جان پڑ گئی اور وہ مولانا کے مضمون کے حوالہ سے فخر کرتے کہ اسلام اور مسلمانوں پر مغربی مستشرقین کا الزام جھوٹا ہے اور اس کا جھوٹ اس علمی تحقیق سے ثابت ہے۔ علامہ مرحوم نے المامون لکھ کر مسلمانوں کی سیاسی وتمدنی عظمت وترقی کو نمایاں کیا اور الفاروق لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اپنے شاندار ماضی پر فخر کرنے اور حوصلہ مندی کے جذبات پیدا کرنے کا کام لیا۔ بلاشبہہ علامہ شبلی نعمانی برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے ایک بڑے کارپرداز اور قائد تھے، جن کے ذریعہ اسی عہد سے اسلامی بیداری کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہوئے''۔(ایضاص ۶)

مولانا مدظلہ کے یہ خیالات ''مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی'' کے دیباچہ سے لئے گئے ہیں جسے انجمن الاصلاح ندوۃ العلماء نے ۲۰۱۸ء میں شائع کیا ہے اور جسے ندوہ کے طلبہ محمد سرفراز عالم اور محمد موسی نے مرتب کیا ہے۔

مولانا مدظلہ نے علامہ شبلی پر اپنے مضامین وخطبات میں بھی اظہار خیال کیا ہے مگر وہ ہمارا موضوع نہیں۔

پروفیسر مغنی تبسم

پروفیسر مغنی تبسم (۱۹۳۰۔۲۰۱۲ء) اردو کے ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور مصنف تھے۔ ماہنامہ سب رس حیدر آباد اور شعر وحکمت حیدر آباد کے مدیر رہے، ان کی تدریسی زندگی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے شعبہ اردو میں گذری، ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں، فانی بدایونی پر ان کی کتاب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۱۹۷۶ء میں ناز صدیقی صاحبہ نے ایک مجموعہ مقالات ''شبلی نقادوں کی نظر میں'' مرتب کیا جو الیاس ٹریڈرس حیدر آباد سے شائع ہوا، اس میں علامہ شبلی کے عظیم الشان کارناموں پر نقادوں کے مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ واقعی بہت عمدہ اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے، مرتبہ ناز صدیقی صاحبہ نے ابتدا میں علامہ شبلی کے مختصر حالات لکھے ہیں، اس کا پیش لفظ پروفیسر مغنی تبسم کے قلم سے ہے۔ جس کا ابتدائیہ یہ ہے:

> ''شبلی نعمانی اردو ادب کی ایک نہایت دلکش، با رعب اور مسحور کن شخصیت ہیں، ان کی حیات ایک مسلسل علمی جہاد سے عبارت رہی، وہ تادم آخر ایک مذہبی جوش اور لگن کے ساتھ علم وادب کی خدمت میں لگے رہے''۔ (شبلی نقادوں کی نظر میں ص ۵)

پروفیسر مغنی تبسم نے سرسید اور شبلی کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ شبلی کو سرسید سے کوئی ذاتی عناد نہ تھا اور ان میں نقطہ نظر کا اختلاف تھا۔ تجزیئے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ:

> ''سرسید کی اصلاحی تحریک نے مغرب سے کسی قدر مرعوب ہوکر ہماری قدیم تہذیب اور تاریخ کی طرف منفی رویہ اپنایا تھا جس میں احساس کمتری شامل تھا، شبلی کی تحریروں نے قوم کو اس احساس کمتری سے باہر نکالا اور یہی شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے''۔ (ایضاص ۶)

شبلی کی ادبی حیثیت اور خاص طور پر ان کے اسلوب نگارش کے تو پروفیسر مغنی بڑے مداح ہیں، شبلی کے مرتبے کا تعین کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ''ایک ادیب کی حیثیت سے شبلی اپنے تمام ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ تاریخ ہو یا سوانح، تنقید ہو یا انشائیہ، ان کا اشہب قلم جس صنف میں رواں ہوا اسے زیر نگیں کرلیا۔
>
> شبلی کے اسلوب میں جو قوت اور صلاحیت ہے وہ کسی کے یہاں نہیں ملتی۔ جب ہم شبلی کی تصانیف کو اس دور کی دوسری نثری تصانیف کے مقابل رکھ دیتے ہیں تو یہ باور نہیں آتا کہ یہ ایک ہی زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ شبلی صحیح معنوں میں جدید نثر کے بانی ہیں۔ انھوں نے نثر کی زبان کو اس معیار پر پہونچا دیا جہاں وہ ہر طرح کے مطالب، جذبات اور خیالات کو مؤثر طور پر ادا کرسکتی ہے۔ شبلی کا اردو نثر میں وہی مرتبہ ہے جو شاعری میں غالب کو حاصل ہے''۔ (ایضاص ۶۔۷)

پروفیسر مغنی تبسم بھی علامہ شبلی کو مظلوم ادیبوں میں شمار کرتے ہیں اور کہتے ہیں مطالعہ شبلی میں زیادہ روایتی معیار کو کام میں لایا گیا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ جدید طرز فکر رکھنے والے محقق ونقاد شبلی کی بازیافت کریں (ایضا)

پروفیسر سید مجاور حسین

پروفیسر سید مجاور حسین (۱۵، اکتوبر ۱۹۳۰ء) نے ۲۰۱۰ء میں موازنہ انیس ودبیر کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔ موازنہ کے متعدد محقق ایڈیشن ہند و پاک سے شائع ہوئے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی ایک ایڈیشن مرتب کیا ہے جسے دار المصنفین نے ۲۰۰۴ء میں شائع کیا، بلکہ اب وہی ایڈیشن مسلسل شائع ہو رہا ہے، اس کا متن پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے جو خود مصنف علامہ شبلی نے ۱۹۰۷ء میں شائع کیا تھا، البتہ اس میں مراثی انیس ودبیر کے مطبوعہ نسخوں سے اس کا تقابل کر کے حوالہ کا اہتمام کیا گیا ہے، اس سے پہلے کے تمام محقق نسخے بھی اسی پہلے ایڈیشن کے متن کی بنیاد پر تیار کئے گئے ہیں بلکہ بعد کے ایڈیشن بھی۔ حتی کہ رشید حسن خاں جیسے محقق ونقاد نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے۔ ڈاکٹر سید مجاور حسین نے سید علی حیدر کی مدد سے جو نسخہ تیار کیا ہے اس کا متن بھی ۱۹۰۷ء ہی کا ہے، البتہ اس میں حواشی لکھے گئے، مصنف کے حالات قلم بند کئے گئے، مراثی کے ترجمے دیئے گئے ہیں اور آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے اس لحاظ سے یہ اب تک کا سب سے اچھا مفید اور معلوماتی ایڈیشن ہے۔

اس قدر محنت وتحقیق سے موازنہ مرتب کرنے کے باوجود مقدمہ میں مرتب کا لب ولہجہ متین اور سنجیدہ ہے، عظمت شبلی اور موازنہ کا اعتراف ہے، فضل امام رضوی کی طرح نہیں کہ کیا کچھ نہیں صرف شبلی اور موازنہ پر بہتیرے اعتراضات نہیں، تنقید نہیں، تنقیص کے انبار لگا دیئے۔ پروفیسر مجاور حسین لکھتے ہیں:

> ''عموماً مرتبین نے شبلی پر جانب داری کا الزام عاید کیا ہے لیکن یہ الزام سطحی انداز میں موازنہ کے مطالعہ کے بغیر شبلی پر لگایا گیا ہے۔ شبلی نے ابتدا ہی میں اپنا نظریہ شعر پیش کر دیا ہے اور اسی معیار پر انھوں نے میر انیس کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔..... شبلی نے نہایت مدلل انداز میں اپنا زاویہ نظر پیش کیا ہے اور ادبی توازن کے ساتھ دونوں با کمال شعرا کے جوہر شاعری کی طرف متوجہ کیا ہے۔
>
> موازنہ کا اہم ترین وصف یہ بھی ہے کہ اس میں تجزیہ، تقابل، اعلی ترین انتخاب مراثی، ذوق سلیم کی جلوہ آرائی اور نقد شعر کا معیار ملتا ہے۔ مرثیہ سے دلچسپی رکھنے والے باذوق طالب علموں کے لئے ہی کتاب اہم نہیں ہے بلکہ علمی اور تقابلی تنقید کی راہیں بھی اس سے کھلتی ہیں''۔ (موازنہ انیس ودبیر، مرتبہ پروفیسر مجاور حسین، ڈاکٹر سید علی حیدر، لکھنؤ، ۲۰۱۰ء)

پروفیسر مجاور حسین نے موازنہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تحسین کے ساتھ اس کے بعض تسامحات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، لیکن اس میں بھی ان کا سنجیدہ انداز قابل ذکر ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''جتنے اہم نسخے ہو سکتے تھے وہ سب پیش نظر رہے، صرف ایک نسخہ جو ۱۹۶۴ء میں پاکستان میں شائع ہوا تھا ہماری دسترس سے باہر رہا۔ نسخوں میں متن کا کہیں اختلاف نہیں ہے، البتہ حواشی میں اختلاف کی گنجائش تھی مگر وہ صرف اس حد تک ملے ''زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے''۔ دبیر کے شاگرد قدیر کا مصرعہ ہے۔ اور ''فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں'' دبیر کا نہیں ہے۔ اور بس! (ایضاً ص ۸)

ڈاکٹر سید رفیق حسین سابق استاد الہ آباد یونیورسٹی نے بھی موازنہ کا ایک نسخہ مرتب کیا تھا جسے الہ آباد کے رام نرائن پبلشرز نے شائع کیا تھا، پروفیسر سید مجاور حسین نے دیباچہ میں اس کا ذکر نہیں حالانکہ کئی لحاظ سے وہ بھی بہت مفید تھا، اس میں بھی عربی وفارسی مراثی کے ترجمے شامل ہیں۔

مولانا صدرالدین اصلاحی (حیدرآباد)

ایمان بالآخرت

اب ہ میں واقعات کی سند کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے اور کس نوع کے خانہ ساز نظریات ہیں، جن کے بل پر یہ گروہ ایمان بالآخرت کو زندہ درگور کرتا ہے۔ اس باب میں اگر ہم بنی اسرائیل کی تاریخ دیانت کو سامنے رکھ لیں تو غالباً اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کا قریب ترین اور کامیاب ترین راستہ اختیار کریں گے، اس لیے کہ یہ وہ قوم ہے جس نے اس مہم کو بڑی کامیابی کے ساتھ سر کیا (تکمیل کیا) ہے اور اس معاملہ میں اس کی جرأت بیباک ذرا مشکل ہی سے اپنی کوئی نظیر رکھتی ہوگی۔ اس نے قیامت کو زبانی طور سے ماننے اور عملی طور پر نہ ماننے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اس کا ''ایمان'' تھا کہ یوم جزاء آنے والا ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ ہمارے لیے ترک واختیار کی ہر راہ کھلی ہوئی ہے اور قیامت کا یقینی وجود ہم سے ہماری آزادی فکر وعمل پر کسی بندش کا طالب نہیں، کیوں؟ اس لیے کہ

الف) ہم اس کے لاڈلے اور چہیتے ہیں نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (مائدہ ۱۸) ''ہم تو اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں'' اور ہمارا گروہ یہودیت میں ہونا اس امر کی ضمانت ہے کہ ہم بہرحال برسر ہدایت ہیں، خواہ ہمارے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا (بقرہ ۱۳۵) ''اور کہتے ہیں تو یہود ونصاریٰ ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے''۔

ب) بنابریں وہ ہمیں ضرور بخش دے گا سَيُغْفَرُ لَنَا (اعراف ۱۶۹) ''یقیناً ہم تو بخش دیئے جائیں گے'' یا اگر اس نے کچھ سرزنش کی بھی تو وہ گنتی کے دنوں سے زیادہ نہ ہوگی لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً (بقرہ ۸۰، آل عمران ۲۴) ہرگز دوزخ کی آگ ہم کو نہیں چھوئے گی''۔

یہ نظریات انہوں نے کیوں گھڑے؟ وہ کون سا محرک تھا جس نے انہیں اس طرح سوچنے پر مجبور کیا؟ کیا ان کی کتاب (تورات نے انہیں یہ نقاطِ نظر دیئے تھے؟ نہیں، ہرگز نہیں، حاشا وکلا، اللہ کا کلام ان خرافات سے بالکل بَری ہے، چنانچہ قرآن نے ان پر صاف لفظوں میں یہ الزام رکھا کہ یہ سب تمہارے نفس کی خواہش (امانی) ہیں، جن کا اللہ کی کتاب سے کوئی تعلق نہیں، پھر ان خرافات کو انہوں نے حقیقت کا جامہ کیوں پہنا رکھا تھا؟ اس کے جواب کے لیے ان کی ذہنیت سیرت اور کردار کی ان تفصیلات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا کافی ہے جو ان کی فرد قرارداد جرم کی حیثیت سے قرآن نے پیش کی ہے اور جن کا مغز قرآن کے اس دو لفظی تبصرے میں موجود ہے وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ، وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا (بقرہ ۹۶) ''تم ان (یہودیوں) کو حیات دنیا کا سب سے بڑا حریص پاؤ گے یہاں تک کہ اس معاملہ میں وہ مشرکوں سے بھی آگے نظر آئیں گے'' اس مختصر اور جامع تبصرے کی تفصیل آپ خود اسی سورہ بقرہ کے اندر دیکھ سکتے ہیں اور اس کے علاوہ اور سورتوں کے اندر بھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مختصر سا جملہ اس باب میں خود ہی پوری طرح کفایت کرتا ہے اور ہر طرح کی شرح وتفصیل سے بے نیاز ہے۔

پھر اس سلسلہ میں یہ بات بھی ناقابل تردید ہے کہ اس انقلاب فکر ونظر کی طبعی ترتیب یہ نہیں ہے کہ ان یہودیوں کی بندگی کی ذمہ داریاں بتائی نہ گئی تھیں، یا یہ کہ حقیقت کا سراغ ان

پر گم ہو گیا تھا اور انہیں یہ ذمہ داریاں معلوم نہ تھیں اور کچھ اتفاقی اسباب تھے، جنہوں نے ان کے ذہنوں میں اپنی محبوبیت اور مغلوبیت کا ایک باطل پندار پیدا کر دیا، جن کے بعد وہ پابندیٔ شرع سے بے پرواہ ہو گئے بلکہ واقعات کی منطقی ترتیب بالکل الٹی ہے، دراصل پہلے انہیں دنیوی زندگی نے اپنا گرویدہ بنایا، اس کے بعد انہوں نے اپنی مغفرت کا عجیب وغریب ''فارمولا'' ایجاد کیا اور اس ایجاد کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بدقسمتی سے ان کا اعتراف تھا کہ ایک یوم جزاء آنے والا ہے، جس کا تقاضا تھا کہ اپنی مادی خواہش پر سخت پابندیاں عائد کرو، حرصِ دنیا کو چھوڑ دو کہ دنیوی دولت اور جاہ منزلت کی بندگی کے ساتھ ساتھ اللہ کی بندگی ممکن نہیں، اس لیے کھلم کھلا دنیا کی پوجا اور آخرت سے بے نیازی ممکن نہ تھی اور لازماً یہ سوال سامنے آ کھڑا ہوا کہ آخرت کے تقاضوں پر کان دھریں یا مفاد نفس کو دیکھیں؟ آخر اللہ نے عقل کے ناخون دیئے تھے، جس سے انہوں نے اس مشکل گرہ کو کھول ہی لیا اور کہا دونوں تقاضے اور دونوں زندگی کے مفاد اپنی جگہ درست اور قابلِ لحاظ ہیں اور ان میں ہماری ذات کی حد تک کوئی تضاد نہیں۔ قیامت آئے گی، حساب کتاب کا ہونا بالکل برحق ہے، مگر ہم بنی اسرائیل ہیں، انبیاء علیہم السلام کے بیٹے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس خانوادۂ اسرائیلی کو کوئی خصوصیت نہ تھی تو دین ودنیا کی ان اعلیٰ ترین نعمتوں اور فضیلتوں، نبوت اور حکومت کی اسی کے اندر کیوں ارزانی فرمائی گئی! یقیناً ہم پیدائشی جنتی ہیں اور ہمارا گروہ، امتِ مرحومہ کا گروہ اور ہمارا دائرہ نجات کا دائرہ ہے۔ جب ہمارے باپ دادا، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون علیہم السلام جیسے مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے حیف ہے، اگر ہم سے عام لوگوں کی طرح حساب کتاب لیا گیا۔

اگر گہری نظر سے ان کے اس انداز فکر کا تجزیہ کیجئے تو بات زیادہ مختلف نہ نکلے گی اور اس کی اصل بھی وہی نظر آئے گی جو اصل کہ پہلے گروہ کے زاویۂ نگاہ کی تھی، یعنی بزرگ ہستیوں کی قطعی شفاعت کا خود تراشیدہ عقیدہ، فراق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ پہلا گروہ اس قسم کی ہستیوں کو صرف شریکِ خدائی یا اللہ کا مقرب ہی نہیں کہتا تھا بلکہ صاف گوئی اور جرأت سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنا معبود اور رب تسلیم کرتا تھا اور ان کے نام پر پتھر کے مجسمے بنا کر علانیہ اور فخریہ ان کی پوجا بھی کیا کرتا تھا، مگر انہیں چونکہ تورات کے لفظوں کی ذرا لاج بھی رکھنی تھی، اس لیے زبان کی حد تک تو ایسا کہنے سے اور عبادت کے معروف معنوں میں ان کی بندگی اور پوجا کرنے سے بچتے رہے، لیکن باایں ہمہ عقیدہ وعمل کی وہ کون سی گمراہی تھی جو مشرکوں اور قیامت کے منکروں میں پائی جاتی ہو اور اس سے ان کا دامن بالکل پاک رہا ہو۔ قرآن نے ان پر کون سا الزام نہیں لگایا، اس نے صاف طور سے ان کے دلوں کو شرک کی ناپاکی سے ملوث بتایا اور انہیں مشرکوں کے سے عقیدۂ شفاعت کا الزام دیا۔ ان سے بار بار جو یہ فرمایا گیا کہ ''اے بنی اسرائیل! اس دن کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے ذرہ برابر بھی ذمہ دار نہ بنے گا، نہ اس کے باب میں کوئی سفارش سنی جائے گی، نہ فدیہ قبول ہوگا اور نہ کہیں سے انہیں مدد پہنچے گی'' (بقرہ ۴۸) تو اس کا مطلب اس کھلی ہوئی تعریض کے سوا کیا تھا کہ تم اپنے بزرگوں کی شفاعت پر نظریں جمائے بیٹھے ہو، حالانکہ اس کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں اور یہ نظریۂ شفاعت ٹھیک وہی نظریہ ہے جس کے بل پر مشرک قومیں اطمینان سے دنیا کی پرستش میں مصروف رہتی ہیں اور جس کے ساتھ ایمان بالآخرت بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ نفس قیامت کے وقوع ہی کی کوئی عقلی ضرورت نہیں باقی رہ جاتی۔

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسانی مساوات کے سب سے بڑے علم بردار

گذشتہ 24 مئی کو امریکہ میں ایک سفید فام پولس کے ہاتھ جورج فلائیڈ نامی ایک سیاہ فام کے بے رحمانہ قتل کے بعد پورے امریکہ میں بل کہ یورپ کے کئی ملکوں میں غضب کی آگ بھڑک اٹھی ہے، لوگ سڑکوں پر اتر آئے ہیں اور Black Lives Matter (سیاہ فام زندگیاں اہمیت رکھتی ہیں) کے نعرے کے ساتھ احتجاج کر رہے ہیں۔ رنگ ونسل کی بنیاد پر امتیازی سلوک بل کہ نفرت وحقارت کا رویہ امریکہ کی تاریخ کا ایک سیاہ باب اور اس کے سماج کا ایک سیاہ داغ ہے، مگر رنگ وخوں اور نسل ونسب کا یہ تعصب صرف امریکہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، یہ ہر زمانے اور ہر علاقے میں پایا جاتا ہے اور پایا جاتا رہا ہے، پیارے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت عرب کے رگ وپے میں انسانی عدم مساوات اور نسلی وعلاقہ جاتی تعصب کا زہر ہلاہل پیوست تھا، آپ ﷺ نے سب کو ایک باپ کی اولاد قرار دے کر رنگ وخوں کے بت کو پاش پاش کیا، آپ ﷺ نے رب کا یہ پیغام سنایا:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً. (النساء: 1)

اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت پھیلا دیے۔

جب سارے انسان ایک باپ کی اولاد ہیں تو پھر رنگ وخوں اور علاقہ وقبیلہ کی بنیاد پر کوئی افضل اور کوئی ارذل کیوں کر ہو سکتا ہے، شعوب وقبائل صرف تعارف کے لیے ہیں نہ کہ فخر وفضیلت اور تکبر وتعصب کے لیے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا. (الحجرات: 13)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد وعورت سے پیدا کیا ہے، اور مختلف خاندان اور کنبے بنا دیے ہیں؛ تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔

انسان ہونے میں سب برابر ہیں، محض پیدائش کی بنیاد پر کسی کو افضلیت حاصل نہیں ہو سکتی، فضیلت اور افضلیت اعمال وکردار کی بنیاد پر حاصل ہوگی نہ کہ پیدائش کی بنیاد پر، حجۃ الوداع کے موقع سے آپ ﷺ نے انسانی مساوات کا جو اعلان فرمایا وہ سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

يا أيها الناس ألا إن ربكم واحد وإن أباكم واحد ألا لا فضل لعربي على أعجمي ولا لعجمي على عربي ولا لأحمر على أسود ولا أسود على أحمر إلا بالتقوى (مسند أحمد برقم: 22978)

اے لوگو! سن لو، تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے، سن لو، کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، فضیلت صرف اور صرف عمل اور تقوی کی بنیاد پر حاصل ہوگی۔

جس کے اعمال وکردار میں کمی ہو وہ چاہے کتنا ہی عالی نسب کیوں نہ ہو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ ، لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ (رواه مسلم عن أبي هريرة في باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن من كتاب الذكر والدعاء برقم: 4996)

جو عمل میں پیچھے رہ جائے وہ نسب کی بنیاد پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔

جب سارے انسان ایک باپ کی اولاد ہیں تو انسان ہونے کی حیثیت سے سارے انسان برابر درجہ کے قابل احترام

ہیں، آپ ﷺ نے رب کا یہ پیغام پوری انسانیت کو سنایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ .(الإسراء: 72)

اور ہم نے اولاد آدم کو عزت بخشی

آپ ﷺ نے ساری خلقت کو اللہ کا کنبہ قرار دیا، اور فرمایا کہ مخلوق میں سب سے افضل وہ ہے جو لوگوں کے سب سے زیادہ کام آتا ہے:

الخلقُ كلُّهم عيالُ اللهِ فأحبُّ الخلقِ إلى اللهِ أنفعُهُمْ لِعيالِهِ (أخرجه الطبراني في المعجم الأوسط برقم: 5541، وأبو نعيم في حلية الأولياء، ج: 2، ص: 102، والبيهقي في شعب الإيمان برقم: 7048 بنحوه)

تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، مخلوق میں اللہ کے نزدیک سب سے محبوب وہ ہے جو اس کے کنبے کے لیے سب نفع بخش ہو۔

رنگ ونسل کی بنیاد پر جس طرح فخر کرنا روا نہیں ہے اسی طرح تعصب برتنا بھی جائز نہیں ہے، یعنی کہ حق کا ساتھ نہ دے کر کسی کا محض اس وجہ سے ساتھ دیا جائے کہ وہ ہماری نسل یا ذات یا ہمارے قبیلے وعلاقے کا فرد ہے:

عَنْ جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، قَالَ: لَيْسَ مِنَّا مَنْ دَعَا إِلَى عَصَبِيَّةٍ ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ قَاتَلَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ ، وَلَيْسَ مِنَّا مَنْ مَاتَ عَلَى عَصَبِيَّةٍ .(رواه أبوداود في سننه عن أبي هريرة في كتاب الآداب برقم: 4521)

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، إِنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِّيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ ، وَفَخْرَهَا بِالْآبَاءِ مُؤْمِنٌ تَقِيٌّ ، وَفَاجِرٌ شَقِيٌّ ، أَنْتُمْ بَنُو آدَمَ وَآدَمُ مِنْ تُرَابٍ (رواه أبوداود في سننه عن أبي هريرة في كتاب الآداب برقم: 4517)

حضرت جبیر بن مطعمؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عصبیت کی طرف بلانے والا ہم میں سے نہیں، عصبیت کی بنیاد پر لڑنے والا ہم میں سے نہیں، اور عصبیت کی حالت میں مرنے والا ہم میں سے نہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالی نے تم سے جاہلی غرور ونخوت اور آبا واجداد کے نام پر فخر وتکبر کو دور کر دیا ہے، انسان یا تو متقی مومن ہے یا بدبخت فاجر، تم آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔

آپ ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ تمہارا بھائی اگر ظالم ہے تو ظلم کرنے میں اس کا ساتھ مت دو؛ بل کہ اس کا ساتھ اس طور پر دو کہ اس کو ظلم سے روکو:

عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ ، قَالَ : قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: انْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُومًا ، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ ، هَذَا نَنْصُرُهُ مَظْلُومًا ، فَكَيْفَ نَنْصُرُهُ ظَالِمًا ؟ قَالَ : تَأْخُذُ فَوْقَ يَدَيْهِ .(رواه البخاري عن أنس رضي الله عنه في باب أعن أخاك ظالما أو مظوما من كتاب المظالم والغصب برقم: 2339)

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ ظالم ہو یا مظلوم، صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مظلوم کی مدد کرنا تو سمجھ میں آیا؛ مگر ظالم کی کیسے مدد کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اس کے ہاتھ پکڑ لو۔

انسانی مساوات کے تعلق سے آپ ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام انسان چوں کہ ایک باپ کی اولاد ہیں اس لیے تمام انسان برابر درجہ کے قابل احترام ہیں، رنگ وخوں، نسل ونسب، قبیلہ وعلاقہ اور ذات پات کی بنیاد پر کسی کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوسکتی، فضیلت صرف دو بنیادوں پر حاصل ہوسکتی ہے، ایک یہ کہ اس کے ظاہری وباطنی اعمال وکردار اعلی درجہ کے ہوں دوسرے یہ کہ وہ مخلوق کے زیادہ سے زیادہ کام آتا ہو، اس سے ہٹ کر اگر کوئی رنگ ونسل کی بنیاد پر فضیلت حاصل کرنا چاہے گا یا علاقائی وقبائلی عصبیت کو ہوا دے گا تو اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، آپ ﷺ نے نہ صرف اس کی تعلیم دی بل کہ عملا اس کی تربیت بھی دی، چناں چہ ایک موقع سے ایک مہاجر اور ایک انصاری کے درمیان جھگڑا ہوگیا، مہاجر نے یا للمهاجرين (اے مہاجرو میری مدد کرو) اور انصاری نے یا للانصار (اے انصاریو میری مدد کرو) کہہ کر پکارا، آپ ﷺ نے جب یہ سنا تو پوچھا: کیا بات ہے؟ جاہلیت کے نعرے کیوں لگائے

جارہے ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا کہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو مارا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس طرح کے نعرے مت لگاؤ، یہ بدبودار ہیں۔ (رواہ مسلم فی باب نصر الأخ ظالما أو مظلوما من کتاب البر والصلة والآداب برقم: 4810)

ذرا غور فرمایئے کہ جب ہجرت ونصرت جیسے مقدس عمل کی بنیاد پر تعصب برتنا آپ ﷺ کی نظر میں بدبودار اور ناگوار ہے تو پھر رنگ ونسل اور ذات پات کی بنیاد پر تعصب برتنا کس قدر گھٹیا اور ناپسندیدہ عمل ہوسکتا ہے۔

سیاہ رنگت کی بنیاد پر عار دلانے اور جھگڑا کرنے کا واقعہ بھی دور نبوی میں ملتا ہے، ایک مرتبہ ایک شخص نے جھگڑے کے دوران دوسرے شخص کی ماں کی سیاہ رنگت کا ذکر کرکے اسے عار دلائی، یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے اس شخص کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ تم نے اس کی ماں (کی رنگت) کا ذکر کرکے اسے عار دلائی؟ آپ نے کئی مرتبہ یہ سوال دہرایا، اس آدمی نے کہا کہ اے اللہ کے رسول میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر اللہ سے معافی مانگتا ہوں، آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اپنا سر اٹھاؤ اور آس پاس موجود لوگوں کو دیکھو، اس نے سر اٹھایا اور رسول اللہ ﷺ کے اطراف موجود لوگوں کو دیکھا، آپ ﷺ نے فرمایا:

مَا أَنْتَ بِأَفْضَلَ مِنْ أَحْمَرَ وَأَسْوَدَ مِنْهُمْ إِلَّا مَنْ كَانَ لَهُ فَضْلٌ فِي الدِّينِ .(مسند إسحاق بن راهويه, رقم: 434)

تم ان لوگوں میں نہ کسی گورے سے افضل ہو اور نہ کسی کالے سے، فضیلت تو دین پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ شیخ ابن بطالؒ نے صحیح بخاری کی شرح میں سند مرسل کے ساتھ ذکر کیا ہے، واقعہ یوں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوذرؓ اور حضرت بلالؓ کے درمیان مباحثہ ہوگیا، حضرت ابوذرؓ نے حضرت بلال کی والدہ کی سیاہ رنگت کا تذکرہ کرکے انھیں عار دلائی، حضرت بلالؓ نے رسول اللہ ﷺ کے حضور پہنچ کر اس کی شکایت کی، آپ ﷺ نے حضرت ابوذرؓ کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے بلال کو برا بھلا کہا اور ان کی ماں کی سیاہ رنگت کا ذکر کرکے انھیں عار دلائی ہے، حضرت ابوذرؓ نے ہاں میں جواب دیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تمہارے دل میں جاہلیت کا کچھ اثر باقی رہ گیا ہے، حضرت ابوذرؓ اپنے کیے پر اس قدر پشیمان ہوئے کہ وہ زمین پر لیٹ گئے اور اپنا رخسار مٹی پر رکھ کر کہا کہ جب تک بلال میرے رخسار پر اپنا پیر نہ رکھیں تب تک میں نہیں اٹھوں گا۔ (شرح ابن بطال لصحیح البخاری، ج1 :، ص: 87)

امتیاز رنگ وخوں کو مٹانے اور بتان شعوب وقبائل کو توڑنے کے لیے آپ ﷺ نے اپنے بعض صحابہؓ کا نکاح قبیلۂ قریش سے باہر؛ بل کہ بعض کا تو قبیلۂ عرب سے باہر کرایا، مثلاً حضرت مقداد کندیؓ کا نکاح آپ ﷺ نے اپنی چچازاد بہن حضرت ضباعہؓ سے کرایا، حضرت زید کلبیؓ جو کہ آزاد شدہ غلام تھے کا نکاح اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب بنت جحشؓ سے کرایا، اسی طرح حضرت زیدؓ کے صاحب زادے حضرت اسامہؓ کا نکاح قبیلۂ قریش کی معزز خاتون حضرت فاطمہ بنت قیسؓ سے کرایا، حضرت مقدادؓ اور حضرت زیدؓ کے بارے میں تو آپ ﷺ کی یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ:

زوجت المقداد وزیدا لیکون أشرفکم عند الله أحسنکم خلقا .(رواہ البیهقی فی السنن الکبری عن الشعبی فی کتاب النکاح برقم13784 :)

میں نے مقداد اور زید کی شادی اس لیے کرائی تاکہ (تمھیں معلوم ہوجائے کہ) تم میں جو سب سے اچھے اخلاق کا حامل ہوگا وہی اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز ہوگا۔

آپ ﷺ کے اصحاب اور حلقۂ احباب میں کسی طرح کی کوئی انسانی تفریق نہیں تھی، آپ ﷺ کے اصحاب میں قریشی بھی تھے اور غیر قریشی بھی، عرب بھی تھے اور عجم بھی، گورے بھی تھے اور کالے بھی، آزاد بھی تھے اور غلام بھی، کھیتی باڑی کرنے والے بھی تھے اور تجار بھی، آپ ﷺ کی نظر میں سب برابر درجہ کے انسان تھے، سب مساوی درجہ کے قابل احترام تھے، رنگ ونسل اور قبیلہ وذات کی بنیاد پر ان میں کوئی تقسیم نہیں تھی، اگر کوئی اچھا کام کرتا تو آپ ﷺ اس سے خوش ہوتے چاہے وہ سیاہ رنگ کا غلام کیوں نہ ہو، اور اگر کوئی غلط کام کرتا تو آپ ﷺ اس سے ناراض ہوجاتے چاہے وہ آپ کے خاندان کا معزز فرد کیوں نہ ہو، آپ ﷺ کی مجلس میں حبشہ

کے بلالؓ بھی ہوتے، روم کے صہیبؓ بھی ہوتے، فارس کے سلمانؓ بھی ہوتے اور مکہ کے بوبکر وعمر بھی ہوتے، آپ ﷺ کی مجلس میں سب کو برابر درجہ کا حق اور برابر درجہ کا مقام ملتا، ایسا نہیں تھا کہ قبیلۂ قریش کے لوگ آپ کے قریب بیٹھتے اور عجم کے غلام آپ سے دور بیٹھتے۔

آج امریکہ ویورپ کے احتجاجی Black Lives Matter (سیاہ فام زندگیاں اہمیت رکھتی ہیں) کے نعرے لگا رہے ہیں، ہمارے نبی ﷺ نے حبشہ کے رہنے والے سیاہ رنگ کے آزاد شدہ غلام کو اتنی اہمیت وعزت دی کہ مکہ کے معزز ترین قبیلہ کے معزز ترین افراد ان پر رشک کیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے : اَبُو بَكْرٍ سَيِّدُنَا ، وَأَعْتَقَ سَيِّدَنَا يَعْنِي بِلَالًا .(رواه البخاري في باب مناقب بلال من كتاب أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم برقم 3577 :)

حضرت ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں اور انھوں نے ہمارے سردار حضرت بلالؓ کو آزاد کیا ہے۔

آپ ﷺ نے سیاہ فام حضرت بلالؓ کا مقام اتنا بلند فرمایا کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت بلال جنت میں ان سے آگے آگے چل رہے ہیں۔

آپ ﷺ نے مساوات کی ایسی تعلیم دی کہ سماج سے رنگ ونسل اور قبیلہ وذات کا امتیاز مٹ گیا، غلام کو آزاد جیسی عزت وحیثیت ملی، سماج کی ایسی تربیت ہوئی کہ جس شخص کے اعمال وکردار اچھے ہوتے وہ معزز سمجھا جاتا چاہے وہ سیاہ رنگ کا غلام کیوں نہ ہوں، اور جس شخص کے اعمال وکردار برے ہوتے اسے برا سمجھا جاتا چاہے وہ عرب کے معزز ترین قبیلہ کا سردار کیوں نہ ہو، آپ ﷺ کی تعلیمات کے نتیجہ میں ایک ایسا سماج تشکیل پایا جس میں غلاموں نے اپنی قابلیت وصلاحیت کی بنا پر امامت وسیادت کے مناصب سنبھالے؛ چناں چہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے مکہ کے گورنر نافع بن عبد الحارث سے پوچھا کہ تم نے مکہ پر کس کو اپنا نائب بنایا ہے، انھوں نے کہا کہ ابن ابزی کو، حضرت عمرؓ نے پوچھا: کون ابن ابزی؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارا ایک آزاد کردہ غلام ہے، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم نے ایک آزاد شدہ غلام کو نائب بنایا ہے؟ انھوں نے کہا کہ وہ قرآن پڑھنے والا اور فرائض کا علم رکھنے والا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا: إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا ، وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ .(رواه مسلم في باب فضل من يقوم بالقرآن من كتاب الصلاة برقم الحديث 1407 :)

یقیناً اللہ اس کتاب کے ذریعہ کچھ لوگوں کا مقام بلند کرے گا اور کچھ لوگوں کو پستی نصیب کرے گا۔

مساوات کی تعلیم پر عمل کرنے کی وجہ سے مسلم سماج میں غلاموں کا مقام اتنا بڑھ گیا تھا کہ وقت کے حکم رانوں کو بھی تعجب ہوتا تھا۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے ہشام بن عبد الملک نے پوچھا کہ مکہ کا سردار کون ہے؟ میں نے کہا: عطاءؒ، اس نے پوچھا: یمن کا؟ میں نے کہا: طاوسؒ، اس نے پوچھا: شام کا؟ میں نے کہا: مکحولؒ، اس نے پوچھا: مصر کا؟ میں نے کہا: یزید بن ابی حبیبؒ، اس نے پوچھا: جزیرہ کا؟ میں نے کہا: میمون بن مہرانؒ، اس نے پوچھا: خراسان کا؟ میں نے کہا: ضحاک بن مزاحمؒ، اس نے پوچھا: بصرہ کا؟ میں نے کہا: حسن بن ابی الحسنؒ، اس نے پوچھا: کوفہ کا؟ میں نے کہا : ابراہیم نخعیؒ، امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ہر نام کے بعد وہ مجھ سے پوچھتا کہ ان کا تعلق عرب سے ہے یا موالی (آزاد شدہ غلاموں) سے، میں کہتا موالی سے، اخیر میں اس نے کہا:

يا زهري , والله لتسودن الموالي على العرب حتى يخطب لها على المنابر والعرب تحتها , فقلت : يا أمير المؤمنين , إنما هو أمر الله ودينه , فمن حفظه ساد , ومن ضيعه سقط .

(الباحث الحثيث شرح اختيار علوم الحديث: 242)

اے زہری! بخدا موالی تو عرب کے سردار بن جائیں گے، حتی کہ منبروں پر ان کے نام کا خطبہ پڑھا جائے گا اور عرب ان کے زیر نگیں رہیں گے، میں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ اللہ کا اور اس کے دین کا معاملہ ہے، جو اس کی حفاظت کرے گا سردار بنے گا اور جو اسے ضائع کرے گا ناکام وگمنام ہوگا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دیہاتی نے بصرہ کے ایک باشندے سے پوچھا کہ اس علاقے کا سردار کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ حضرت حسن بصریؒ، دیہاتی نے پوچھا کہ کیا وہ آزاد

شدہ غلام ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، دیہاتی نے پوچھا کہ پھر وہ سردار کیسے بن گئے؟ اس آدمی نے جواب دیا کہ لوگ ان کے علم کے محتاج ہیں اور وہ لوگوں کی دنیا سے بے نیاز ہیں، دیہاتی نے یہ سن کر کہا کہ قسم بخدا سرداری اسی کو کہتے ہیں۔ (حوالۂ سابق)

سماجی انصاف اور انسانی مساوات کی تعلیمات کا ہی یہ ثمرہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ غلاموں کی حکومت کا سنہرا باب اپنے اندر رکھتی ہے، حکومت کے مختلف مناصب تو ہر دور میں غلاموں کو حاصل رہے؛ مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ زائد از ایک غلامواقع پر نے باضابطہ حکومت کی باگ ڈور خود مختارانہ اپنے ہاتھ میں لی، مصر میں زائد از ڈھائی سو سال غلاموں نے حکومت کی، جو تاریخ میں دولۃ الممالیک کے نام سے جانی جاتی ہے، یہ ایوبی سلطنت کے بعد 1250 میں قائم ہوئی اور 1517 تک قائم رہی۔ بھارت میں بھی غلاموں نے خود مختارانہ حکومت کی جو زائد از آٹھ دہائیوں پر محیط ہے، اور تاریخ میں اسے خاندان غلاماں کی حکومت سے جانا جاتا ہے، یہ محمد غوری کے انتقال کے بعد 1206 میں قائم ہوئی اور 1290 تک باقی رہی، اس کی بنیاد دہلی سلطنت کے پہلے حکمراں قطب الدین ایبک نے رکھی جو محمد غوری کا غلام تھا، گویا دہلی سلطنت کا آغاز غلاموں کی حکومت کے ذریعہ ہوا، غلاموں کی اس حکومت میں قطب الدین ایبک کے علاوہ دو اور غلام بھی بہت مشہور ہوئے، ایک شمس الدین التمش جو قطب الدین ایبک کا غلام تھا، اور دوسرے غیاث الدین بلبن جو التمش کا غلام تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعد خلفاء راشدین کا دور انسانی مساوات اور سماجی انصاف کا زریں دور ہے، میں اس دور کی دو مثالیں ذکر کرنا چاہوں گا، دونوں ہی مثالیں حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کی ہیں، ایک تو وہی بیت المقدس کے سفر کی مشہور مثال ہے کہ حضرت عمر اپنے غلام کے ساتھ بیت المقدس کے سفر پر روانہ ہوئے، سواری ایک تھی اور سوار دو، حضرت عمر نے یہ طے کیا کچھ دور میں سوار رہوں گا اور تم سواری کی نکیل پکڑ کر چلنا اور کچھ دور تک تم سوار رہنا اور میں سواری کی نکیل پکڑ کر چلوں گا، یہ دونوں سفر کرتے ہوئے شہر قدس پہنچے، جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو سوار ہونے کی باری غلام کی تھی اور نکیل پکڑنے کی باری حضرت عمر کی، غلام نے چاہا کہ حضرت عمرؓ سوار ہو جائیں اور وہ سواری کی نکیل پکڑ کر پیدل چلے؛ لیکن حضرت عمرؓ تیار نہیں ہوئے۔ اس سے بڑھ کر انسانی مساوات کی کیا مثال ہو سکتی ہے کہ وقت کی سپر پاور سلطنت کا حکمراں اپنے اور اپنے غلام کے درمیان کسی طرح کے امتیازی سلوک کو روا نہیں سمجھتا ہے، وہ غلام کو بھی سوار ہونے کا اتنا ہی حق دیتا ہے جتنا کہ خود کو دیتا ہے، وہ اس رویہ کو انسانی مساوات کے خلاف سمجھتا ہے کہ وہ تو سواری پر آرام سے بیٹھا رہے اور اس کا غلام نکیل پکڑ کر پیدل چلتا رہے۔

دوسری مثال مصر کے فاتح و گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کی ہے، واقعہ یوں ہے کہ ایک مصری قبطی نے حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے سے (غالباً گھوڑ سواری میں) مسابقہ کیا اور سبقت لے گیا، حضرت عمرو بن العاص کے لڑکے نے اس قبطی کو کوڑے رسید کیے اور کہا کہ میں شریف زادہ ہوں (أنا ابن الأ کرمین) وہ قبطی گو غیر مسلم تھا؛ لیکن اسے پتہ تھا کہ اسلام سماجی انصاف اور انسانی مساوات کی تعلیم دیتا ہے اس لیے وہ انصاف کے لیے مصر سے مدینہ کے لیے روانہ ہوا، مدینہ پہنچ کر اس نے حضرت عمرؓ کے سامنے پورا واقعہ سنایا، حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو خط لکھا کہ وہ اپنے بیٹے کے ساتھ مدینہ حاضر ہوں، جب وہ اپنے بیٹے کے ساتھ مدینہ آئے تو حضرت عمرؓ نے اس قبطی کو بلایا، اور کہا کہ یہ کوڑہ لو اور اسے مارو، چناں چہ وہ کوڑا لے کر مارنے لگا، اور حضرت عمر نے اس سے کہا کہ مارو شریف زادے کو، اسی موقع سے حضرت عمرؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو یہ تاریخ ساز جملہ کہا تھا:

مذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا !؟

(أخرجها ابن عبد الحكم عن انس في فتوح مصر وأخبارها، ص 290 ، وانظر: مناقب أمير المؤمنين عمر بن الخطاب لابن الجوزي: ص 97 :)

تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا؟ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنا تھا۔

انصاف اور مساوات کا یہ کیسا اعلی نمونہ ہے کہ مملکت کے فاتح وحاکم کے بیٹے کو اس مملکت کے ایک عام شہری پر کسی طرح کی کوئی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہے، قانون کی نظر میں دونوں برابر

درجہ کے انسان ہے، قانون یہ نہیں دیکھتا کہ کون کس کا بیٹا ہے، قانون یہ دیکھتا ہے کہ قصور کس کا ہے، اگر قصور فاتح وحاکم کے بیٹے کا ہے تو قانون ایک عام شہری کے ہاتھوں اس شریف زادے کو کوڑے مرواتا ہے، اسلام نے جس مساوات کی تعلیم دی ہے وہ حق اور ناحق کا فیصلہ کرنے کے لیے مذہب بھی نہیں دیکھتا، وہ مظلوم کا ساتھ دیتا ہے، خواہ وہ ایک غیر مسلم قبطی کیوں نہ ہو، اور ظالم کو سزا دیتا ہے خواہ وہ گورنر کا بیٹا کیوں نہ ہو، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سماجی زندگی میں سب برابر درجہ کے قابل احترام ہیں، ساری مخلوق ایک خاندان اور سارے انسان آپس میں بھائی ہیں، جو اپنے بھائی کے جتنا زیادہ کام آئے وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے مطابق اتنا زیادہ افضل ہے، اقبالؒ کے الفاظ میں:

Islam does not recognise the differences of race, of caste or even of sex. It is above time and above space and it is in this sense that all mankind are accepted as brothers,"
B.A.Dar, Letters and Writings of)
(Iqbal,pp.75-76

اسلام نسل، ذات اور جنس کی تفریق سے نا آشنا ہے، یہ زمان ومکاں کی قید سے اوپر اٹھ کر تمام انسانوں کو بھائی کے طور پر قبول کرتا ہے۔

آج کے ترقی یافتہ ممالک انسانی حریت، مساوات اور اخوت کے جن اصولوں کو اپنے دساتیر میں جگہ دینے پر فخر محسوس کرتے ہیں، ہمارے نبی ﷺ نے اس دور میں جب کہ پوری دنیا رنگ وخوں کے تعصّبات اور نسل ونسب کے امتیازات سے گھری ہوئی تھی، نہ صرف یہ کہ ان اصولوں کی تعلیم دی، بل کہ ان اصولوں کی بنیاد پر ایسا سماج تشکیل دیا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی، یہ ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف خود مغربی مفکرین نے کیا ہے، چناں چہ ایچ جی ویلز H.G Wells اپنی کتاب Concise History of the World میں رقم طراز ہے:

Although the sermons of human freedom, fraternity and equality were said before. We find a lot of these sermons in Jesus of Nazareth, but it must be admitted that it was Mohammad who for the first time in history established a society based on these principles."

اگر چہ انسانی حریت، مساوات اور اخوت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی کیے گئے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کے بارے میں مسیح ناصری (حضرت عیسیٰ) کے ہاں بھی بہت سے مواعظ حسنہ ملتے ہیں؛ لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ صرف محمد عربی (ﷺ) ہی تھے جنھوں نے تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ بالفعل ایک باضابطہ معاشرہ انہی اصولوں پر قائم کر کے دکھایا۔

ہمارے نبی ﷺ نے انسانی مساوات، اخوت اور سماجی انصاف کی جو تعلیم دی تھی آج دنیا اس کی پیاسی ہے، رنگ ونسل کا امتیاز، ذات پات کی لعنت اور عرب وعجم کا تعصب نوع انساں کے لیے ناسور ہے، مسلم قوم بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے، یہ قوم بھی اپنے گھٹیا مفادات کی خاطر امتیاز رنگ وخوں کی خوگر اور بتان شعوب وقبائل کی پرستار بن چکی ہے، عرب وترک کے امتیاز نے خلافت عثمانیہ کی بخیہ ادھیڑی تھی اور اس امتیاز وتعصب کی بنیادیں اتنی گہری ہیں کہ ایک صدی ہونے کو آرہی ہے مگر عرب وترک کے پیرہن کا چاک ابھی بھی تشنۂ رفو ہے، عرب وترک جانے کی کیا ضرورت ہے؟ خود بھارت کے مسلمانوں کا حال دیکھ لیجئے، جہاں فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں، یہاں کے مسلمانوں میں مختلف نوعیّتوں کا تعصب پایا جاتا ہے، مسلکی تعصب، علاقائی تعصب، ادارہ جاتی تعصب وغیرہ وغیرہ، ان سب کے ساتھ ذات پات کی لعنت مستزاد، جس قوم کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ذات پات کی لعنت سے اس سرزمین کو پاک کرے، وہ قوم خود ذات پات کی لعنت میں مبتلا ہے، بھارت میں رائج ذات پات کا سب سے وسیع اور گہرا مطالعہ ڈاکٹر امبیڈکر نے کیا ہے، انھوں نہ صرف یہ کہ ذات پات کے خاتمہ کے لیے علمی کاوشیں کیں؛ بل کہ اپنی عملی زندگی بھی اسی مقصد کے لیے وقف کردی، ہمیں ان کے بعض نظریات سے بہت سخت اختلاف ہے؛ لیکن ان کا یہ تجزیہ مبنی برحقیقت ہے کہ اسلام نے ذات اور نسل کی تفریق کو ختم کیا مگر بھارتی مسلمانوں

سے ذات پات کی لعنت ختم نہ ہوسکی، وہ کہتے ہیں :

Although Islam is the one religion which can transcend race and colour and unite diverse people into a compact brotherhood, yet Islam in India has not succeeded in uprooting caste from among the Indian Musalmans. Caste feeling among the Musalmans is not so virulent as it is among the Hindus. But the fact is that, DR. BABASAHEB)it exists. AMBEDKAR : WRITINGS AND (SPEECHES. V: 5, P: 245

گو کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو رنگ ونسل کے امتیازات مٹا کر متنوع لوگوں کو اخوت کی لڑی میں پرونے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ مگر اس کے باوجود بھارت میں اسلام بھارتی مسلمانوں کے درمیان سے ذات پات کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہوا، ذات پات کا احساس مسلمانوں کے درمیان ہندوؤں جیسا شدید تو نہیں ہے مگر پھر بھی ہے، حقیقت یہی ہے۔

بھارتی سماج کا مطالعہ کرنے والے دیگر محققین ومصنفین نے بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں ذات پات پائی جاتی ہے، مثلاً سید سخی حسن نقوی لکھتے ہیں:

ذات پات کی تفریق ہندو قوموں پر ہی اثر انداز نہیں ہوئی؛ بل کہ اس نے اپنے دامن میں ان مذہبوں کو بھی سمیٹ لیا جن کے نزدیک ذات پات کی تفریق ممنوع ہے، مثلاً مسلمانوں اور سکھوں نے جو مساوات کے قائل ہیں، نسلی امتیاز یا پیشوں کی بنیاد پر اپنے اندر بہت سے گروہ یا برادریاں بنائیں، جو شادیاں صرف اپنی ذات یا برادری میں کرتی ہیں اور غیر برادری میں شادی بیاہ کو معیوب خیال کرتی ہیں۔ (ہمارا قدیم سماج: سید سخی حسن نقوی:160)

ضرورت ہے کہ مسلم قوم اپنے اندر سے رنگ وخوں، ذات ونسل اور علاقہ وادارہ کے امتیازات کو دور کرے اور اپنے نبی کا پیغام اخوت ومساوات لے کر اٹھے تاکہ دنیا میں وہ سماج تشکیل پا سکے جس کی بنیاد اخوت ومساوات پر ہو۔

سردار سلیم۔حیدرآباد

غزل

کیا خبر صبح کہاں شام کہاں ہوگئی ہے
گمشدہ شے کی طرح عمر رواں ہوگئی ہے

روز افسانے سلگتے ہیں تری یادوں کے
زندگی جلتے ہوئے گھر کا دھواں ہوگئی ہے

دل دھڑکتا ہے تو پڑ جاتی ہے سینے میں دراڑ
ایک اک سانس اذیت کا نشاں ہوگئی ہے

دھند چھٹ جائے گی سورج کے علاقے میں چلو
خواب کے شہر سے نکلو کہ اذاں ہوگئی ہے

اب تو آئے گی کلہاڑی سے بھی صندل کی مہک
اک لکڑہارے کی شہزادی جواں ہوگئی ہے

مفلسی آئی تو خودداری کا بھانڈا پھوٹا
دوستوں پر مری سچائی عیاں ہوگئی ہے

اب غریبوں کو دیا جائے گا حق جینے کا
ظل سبحانی کی جانب سے بھی ہاں ہوگئی ہے

داد دیتی ہیں مجھے سن کے ہوائیں بھی سلیم
شاعری میری چراغوں کی زباں ہوگئی ہے

جی۔بی عائشہ۔ریسرچ اسکالر،ایس وی یونیورسٹی تیروپتی آندھراپردیش

امجدؔ حیدرآبادی اور ڈاکٹر زورؔ توافُق وتناقُص

تاریخ ادب میں شہر حیدرآباد کی عظمت واہمیت دہلی اور لکھنؤ سے کچھ کم نہیں۔اس سرزمین سے وابستہ سیکڑوں نامور شعراء و اُدباء رہے ہیں۔ان ہی بے شمار شعراء واُدباء میں حضرت سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ بھی شامل ہیں۔ان دونوں حضرات پر بہت کچھ لکھا جاچُکا ہے اور لکھا جارہا ہے۔مستقبل میں بھی اس کی اُمید کی جاسکتی ہے۔زبان وادب کی تاریخ میں ان دونوں نے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ان کی شناخت اور شہرت خود ان کی حیات میں بامِ عروج پر پہنچ چکی تھی،ان کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد بھی بلکہ آج بھی دنیا کے مختلف ممالک میں جہاں جہاں اردو کے ادارے اور انجمنیں قائم ہوئی ہیں وہاں وہاں اردو شعر وادب کے یہ دونوں سپوت اپنی شناخت رکھتے ہیں۔میرے اس مختصر مقالے کا عنوان ''امجدؔ حیدرآبادی اور ڈاکٹر زورؔ'' میں توافُق وتناقُص ہے۔میں نے اردو شعروادب کی ان دو معتبر اور بلند پایہ شخصیات پر قلم اُٹھاتے ہوئے اپنے آپ کو اپنے موضوع کے دائرے میں محدود کرلیا ہے۔

انسان افتادِ طبع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مزاج ومذاق پسند وناپسند،ذوق وشوق،قد وقامت اور رنگ و روپ جیسی کئی باتوں میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے،اور کئی ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو بعض بعض اشخاص میں مشترک نظر آتی ہیں،لیکن اس اشتراک کا صدفی صد ایک جیسا ہونا بھی ضروری نہیں اور نہ ایسا ممکن ہے۔میں نے ذیل میں امجدؔ حیدرآبادی اور ڈاکٹر زورؔ کی شخصیتوں،طبیعتوں اور ان کے کام کے توافُق (یعنی ایک جیسی باتوں) اور تناقُص (یعنی ایک دوسرے سے مخالف باتوں) کی نشاندہی کرنے کی سعی کی ہے۔

جب ہم ان دو بلند پایہ شخصیات کی اقدار مشترک پر نظر ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں ان دونوں کا حیدرآبادی ہونا ہماری توجہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اس طرح دونوں کا مولود ومسکن حیدرآباد ہے۔دونوں سلطنتِ آصفیہ کے آخری دور کے شاہد رہے ہیں۔یہ وہ دور ہے جب حیدرآبادی تہذیب اور اس کی اعلیٰ قدریں بامِ عروج پر پہنچ چکی تھیں۔

دونوں اپنے اپنے طور پر حیدرآبادی تہذیب کے نمائندہ رہے ہیں۔دونوں نے قریب قریب ایک ہی زمانہ پایا تھا تو گویا دونوں ایک دوسرے کے ہمعصر بھی تھے۔دونوں کی شہرت کا باعث اردو شعروادب رہا ہے۔دونوں نے آخری سانس تک اردو شعروادب کی خدمت انجام دی ہے اور اپنے قلم وقرطاس اور فکر وفن سے زبان کے دامن کو وسیع کیا ہے۔امجدؔ نے شاعری کے علاوہ نثر میں بھی اپنی آٹھ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ڈاکٹر زورؔ نے شاعری ضرور کی ہے لیکن تحقیق،تنقید ولسانیات پر ان کی جو کُتب ہیں۔وہ ادب کے مذکورہ موضوعات کی مبادیات سمجھی جاتی ہیں۔دونوں پیشۂ تدریس سے وابستہ رہے۔دونوں مشرقی علوم سے گہرا شغف رکھتے تھے۔دونوں میں تجرِ علمی اور اخلاقی پاکیزگی کا عالم بھی ایک جیسا تھا۔دونوں میں قلندرانہ شان پائی جاتی تھی۔دونوں کے دل صاف اور دونوں میں عفو اور درگذر کا پہلو بدرجہ اتم موجود تھا۔یہی وہ خوبیاں تھیں کہ جن کی بدولت ان کی شخصیتیں بڑی پرکشش ہوگئی تھیں۔جو کوئی ان سے ایک بار ملتا بار بار ملنے کی آرزو رکھتا تھا۔دونوں ایک دوسرے کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔دونوں ایک

دوسرے کی عزت وعظمت کے معترف بھی تھے۔ ذیل میں دیئے گئے ڈاکٹر زورؔ کے اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کس قدر امجدؔ کی شخصیت اور شاعری سے متاثر تھے۔ فرماتے ہیں:

''حضرت امجدؔ کے کلام سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کی ہم پلہ بن گئی بلکہ حیدرآباد کی عزت وآبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا۔ جس پر یہاں کے رہنے بسنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے۔ گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک ایسے منفرد شاعر دکن میں پیدا ہوئے تھے جن کا احترام پوری اردو دنیا میں کیا گیا اور جن کی ہندوستان گیر شہرت ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہوئی۔'' (پروفیسر مغنی تبسم۔ ''نگارشاتِ زور'' صفحہ 88)

یہی اعتراف واحترام تھا کہ ڈاکٹر زور اپنے گھر پر ہونے والے مشاعروں میں امجدؔ کو مدعو کیا کرتے تھے۔ جب ''ایوانِ اردو'' کی عمارت کا سنگِ بنیاد رکھا جارہا تھا۔ ڈاکٹر زورؔ نے امجدؔ کو اس تقریب میں نہ صرف مدعو کیا بلکہ ان سے ادارے کے قیام اور ترقی کے لئے دُعائیں بھی لیں۔

''ادارۂ ادبیاتِ اردو'' کے قیام کے بعد ڈاکٹر زور نے امجدؔ کی ڈائمنڈ جوبلی کا بھی اہتمام کیا۔ اس تعلق سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمایئے۔ جو محمد جمال شریف کی تالیف ''حیاتِ امجدؔ'' سے ماخوذ ہے۔

''بتاریخ ۳۱ر جنوری ۱۹۵۵ء حیدرآباد کی مشہور ادبی انجمن ''ادارۂ ادبیات اردو'' کی جانب سے امجدؔ کی چہل سالہ شاعرانہ خدمات کے اعتراف میں ''جشن الماس'' (ڈائمنڈ جوبلی) نہایت اہتمام سے منایا گیا ۔۔۔۔۔ امجدؔ ان چند خوش نصیب شعراء میں سے ایک ہیں جن کو قبولیتِ عام کی سند ان کی زندگی ہی میں مل گئی ایک لحاظ سے تو امجدؔ واحد شاعر ہیں جن کا جشن الماس منایا گیا۔'' (محمد جمال شریف ''حیاتِ امجدؔ صفحہ ۲۱)

اس جشن میں ایک سپاس نامہ ڈاکٹر زورؔ نے امجدؔ کی خدمت میں پیش کیا جس میں انہوں نے امجدؔ کی شخصیت اور ان کی خدمت کا اعتراف کیا ہے۔ امجدؔ نے بھی جواب سپاس نامہ میں ڈاکٹر زورؔ اور ان کے تمام احباب کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے جشنِ الماس کے منانے کا اہتمام کیا تھا۔ اب تک جن باتوں کا اظہار میں نے کیا ہے وہ امجدؔ اور ڈاکٹر زورؔ کے درمیان اقدارِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آئیے اب ان چند باتوں پر بھی نظر ڈال لیں جو ان دو بلند پایہ شخصیات میں قدرِ مشترک کی حامل نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ امجدؔ ایک صوفی منش، سادہ مزاج، متین اور خاموش انسان تھے برخلاف اس کے ڈاکٹر زور ایک وسیع المشرب، مجلسی اور بارُعب انسان تھے۔ امجدؔ کے مزاج کی طرح ان کا لباس بھی سادہ ہوتا تھا اکثر قمیص یا کرتا زیب تن کرتے تھے۔ گھر میں ہوتے تو سیاہ رنگ کا تہہ بند باندھے رہتے تھے۔ جبکہ زورؔ صاحب پروفیسر اور پرنسپل کے عہدوں پر فائز رہے۔ اس لحاظ سے شیروانی اور بعض اوقات سوٹ بھی زیب تن کیا کرتے تھے۔ زورؔ نے بیرونی ممالک کے سفر کئے جبکہ امجدؔ کو ملک سے باہر صرف بغرض حجِ بیت اللہ ہی جانا ہوا۔ امجدؔ کا مزاج خلوت پسندانہ تھا خود فرماتے ہیں۔

دنیا کے ہر ایک ذرے سے گھبراتا ہوں
غم سامنے آتا ہے، جدھر جاتا ہوں
رہتے ہوئے اس جہاں میں مُدّت گذری
پھر بھی اپنے کو اجنبی پاتا ہوں

اس کے برخلاف زورؔ صاحب صبح سے شام تک طلباء وطالبات احباب اور ملنے جُلنے والوں، ادیبوں اور شاعروں کے جُھرمٹ میں رہتے تھے۔ یوں بھی زورؔ صاحب بذاتِ خود ایک انجمن تھے۔

امجدؔ ایک پُر گو شاعر تھے اور پر گو بھی اس قدر کہ انہیں فی البدیہہ رباعیات وقطعات کہنا مشکل نہ تھا جبکہ زورؔ صاحب بہت ہی کم گو واقع ہوئے تھے۔

زورؔ صاحب کی توصیف میں امجد کے لکھے ''قطعات پیش پن۔ ایک قطعہ فارسی میں ہے اور دوسرا اردو میں لکھا ہے

قطعہ فارسی

ایں مسمّٰی زندہ ماند ہمچو اسم
محی اردو ہست محی الدین ما
دوستاں رایاد داریم از دعا
ہست اے امجدؔ ہمیں آئینِ ما

قطعہ اردو

دکھلایئے گا حمد الٰہی کے مناظر
تا مدح کریں آپ کی ہم اور زیادہ
ہے زورؔ کی تحریر میں کیا زور خداداد
اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

جبکہ زورؔ صاحب نے اپنے مضامین کے ذریعہ امجدؔ کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔

امجد کا انتقال حیدرآباد میں ہوا اور درگاہ شریف شاہ خاموش رحمتہ اللہ علیہ کے احاطہ میں تدفین عمل میں آئی۔ جبکہ زورؔ کا انتقال کشمیر میں ہوا جہاں وہ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ میت حیدرآباد لائی نہ جاسکی۔ کشمیر میں خانیار شریف کے احاطہ میں تدفین عمل میں آئی۔ امجدؔ کی کوئی اولاد نہ تھی جبکہ زورؔ صاحب اولاد تھے۔ لیکن ان دونوں حضرات کی شہرت اور یاد کا باعث ان کی اولاد نہیں بلکہ ان کے وہ حیات آفرین کارنامے ہیں جن پر موت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امجدؔ ہوں کہ زورؔ صاحب آج بھی ہمارے دلوں اور ذہنوں میں زندہ ہیں اور اپنی تصانیف اور کارہائے نمایاں کی بدولت ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ خود زورؔ صاحب بھی اس حقیقت سے واقف تھے فرماتے ہیں ۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

کتابیات :

(۱) ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ
حیات شخصیت اور کارنامے
پروفیسر مغنی تبسم

(۲) ماہنامہ نقوش (جلد اول)
شخصیات نمبر-329
امجد حیدرآبادی- نصیر الدین ہاشمی

(۳) ڈاکٹر زورؔ
(سیدہ جعفر)

(۴) حیدرآباد میں اردو ادب کی تحقیق
ڈاکٹر آمنہ تحسین
ڈاکٹر زورؔ صفحہ نمبر-164

(۵) دکن میں شعر وادب
تنقیدی مضامین
صابر علی سیوانی

(۶) سخنورانِ حیدرآباد (حیدرآباد میں اردو شاعری آزادی کے بعد)
ڈاکٹر سید بشیر احمد

(۷) حیاتِ امجد ، محمد جمال شریف

(۸) افاداتِ زورؔ (جلد اول)
از: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مرتب سید رفیع الدین قادری

ڈاکٹر صالحہ صدیقی۔محلّہ نوادہ الہ آباد

آزادی کے بعد ادب اطفال میں خواتین ہند کی خدمات

اردو میں بچوں کے ادب پر دلچسپ مواد دیکھنے کو ملتے ہیں ۔جنھیں مخصوص سیدھے سادے ،مزیدار سبق آموز صورت میں دلچسپ انداز میں لکھا جاتا ہے۔یوں تو آزادی سے قبل بھی ادب اطفال پر مواد دیکھنے کو مل جاتے ہی ں لیکن اردو میں بچوں کے لئے مخصوص قسم کا نثری ادب،شعوری طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد ارتقاء پذیر ہوا۔اس سے قبل بچوں کے لئے شاعری میں نصاب الصبیان جیسی کچھ درسی کتابیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔متعدد خواتین نے بچوں کے لئے درسی وغیر درسی اصناف ادب میں بچوں کے لیے کم وبیش کتابیں لکھیں،تراجم کیے اور بہت سی کتابیں مرتب بھی کیں۔ادب اطفال کے میدان میں خواتین بیسویں صدی کے آغاز میں داخل ہوئیں۔جب مولوی سید ممتاز علی (والد سید امتیاز علی تاج) نے ۱۹۰۹ء) میں بچوں کا مشہور جریدہ "پھول" لاہور سے جاری کیا،اس رسالہ میں خواتین نے بھی لکھنا شروع کیا۔تاج کی والدہ محمدی بیگم ایک اچھی ادیبہ تھیں۔انہوں نے بچوں کے لئے نظمیں گیت،کہانیاں وغیرہ لکھیں جو بعد میں تاج گیت،امتیاز پچیسی،ریاض پھول،وغیرہ کتابوں میں شائع ہوئے،اسی زمانے میں ایک اور اہم ادیبہ خواجہ حسن نظامی دہلوی کی اہلیہ لیلیٰ خواجہ بانو تھیں۔جنہوں نے بچوں کے لئے کئی دلچسپ سبق آموز کہانیاں لکھیں۔ان کا مجموعہ خواجہ مرحوم نے ۱۹۱۹ء میں شائع کیا تھا۔اسی زمانہ میں نذر سجاد حیدر بھی اس میدان میں داخل ہوئیں اور بچوں کے لئے کئی کہانیاں لکھیں۔حجاب امتیاز علی شادی کے بعد لاہور میں اشاعتی ادارہ اشاعت پنجاب لاہور،اخبار پھول اور تہذیب نسواں رسائل سے منسلک ہوئیں تو انہوں نے اخبار پھول کی ادارت میں بھی حصہ لیا اور بچوں کے لئے کہانیاں ڈرامے وغیرہ بھی لکھے۔اس طرح آمنہ نازلی علامہ راشد الخیری کی بہو اور رازق الخیری کی اہلیہ نے اپنے خاندان کے بچیوں کے پرچے بنات سے وابستہ رہیں۔اس طرح آزادی تک مختلف خواتین بچوں کے لئے نظمیں کہانیاں، ڈرامے ، معلوماتی مضامین لکھتی رہیں۔لیکن جدید طرز کا نثری ادب اطفال ۱۸۵۷ء کے بعد ظہور پذیر ہوا۔خصوصا سرسید اور ان کے عظیم رفقاء کار اور نامور ہم عصروں نے اردو میں بچوں کے ادب کی اہمیت کو سمجھا اور شعرا نے اپنی شاعری میں اور نثر نگاروں نے اپنی تحریروں میں بچوں کی عمر، ذہن، پسند ناپسند ضرورت ،اخلاق و شعور،ان کی نفسیات وغیرہ کو ملحوظ رکھ کر ان کے لئے مناسب موضوعات پر تحریر رقم کیں۔سرسید کی کچھ تحریریں،حالی،محمد حسین آزاد،مولوی نذیر احمد، شبلی،مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، ذکاء اللہ، وغیرہ کی بچوں کی تعلیمی تربیتی ضروریات کی تکمیل کے لئے اور ان کی عام دلچسپی و معلومات کی تسکین کے لئے کئی تحریریں وجود میں آئیں جن کا استعمال آج تک بچوں کے تدریسی ادب اور عام دلچسپی و معلومات کے ادب میں ہوتا آیا ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی اردو میں ادب الاطفال میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ نئے نئے ادیب اس میدان میں داخل ہونے لگے تھے۔شعوری طور پر بچوں کے لئے مختلف کتابیں اور نئے نئے رسالے جاری ہونے لگے تھے۔بچوں کے ادب، درسی اور عام ادب کی اشاعت کے لئے کئی ادارے وجود میں آئے اور ان کے لئے درسی و غیر درسی کتب لکھی اور شائع کی جانے لگیں۔حتیٰ کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر بچوں کا ادب لکھا اور شائع ہونے لگا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز ۱۹۰۱ء سے لے کر آزادی ۱۹۴۷ء تک بے شمار ادیبوں نے بچوں کے لیے مختلف اصناف میں نثری ادب تخلیق کر ادب اطفال کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو ادب الاطفال کے فروغ میں مردوں کے ساتھ خواتین نے بھی حصہ لیا ہے۔آزادی کے بعد کئی خواتین ادب اطفال کے میدان میں داخل ہوئیں اور انہوں نے اپنی شاعری اور نثر نگاری سے اردو ادب اطفال کو فروغ بخشا ہے۔ نثر میں انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں قصص، ناول، تلخیص ،

ڈرامے معلوماتی مضامین، درسی کتب لکھنے کے ساتھ صحافتی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ کئی غیر زبانوں کی کتابوں کے ترجمے کئے اور بیسویں صدی کے اختتام تک اردو ادب الاطفال کو اپنی گوناگوں تخلیقات سے رنگارنگ لہلہاتا چمن بنادیا۔ ان میں سے کچھ خواتین تو ایک آدھ چیز لکھ کر خاموش ہوگیں۔ کچھ خواتین لکھتی رہیں اور کئی نے اپنی کتابوں کو شائع بھی کرایا۔ اس طرح بیسویں صدی کا اردو ادب الاطفال ایک بسیط عظیم و وقیع شعبہء ادب کی شکل میں نمودار ہوا۔

آزادی کے بعد اردو ادب اطفال کے فروغ میں جن خواتین خواتین ہند نے اپنی بیش بہا خدمات انجام دیں ان میں ایک اہم نام آصفہ مجیب کا شامل ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی اہلیہ آصفہ مجیب، ایک اچھی مصنفہ گزری ہیں۔ انہوں نے جامعہ کی تحریک سے متاثر ہوکر بچوں کے ادب پر بھی خاص توجہ کی، جامعہ نے بچوں کی تعلیم و تربیت و ادب پر جو کام کیا ہے اور اس سے منسلک ادیبوں نے جس طرح بچوں کے ادب کی خدمات کی ہے وہ ہمارے ادب الاطفال کا ایک روشن پہلو ہے۔ آصفہ مجیب نے بھی بچوں کے لئے کافی کچھ لکھا وہ ان کی کتاب (مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۹۲ء) اور مختلف رسائل، پیام تعلیم وغیرہ میں شائع ہوا۔ یہ ان کی ایک معلوماتی کتاب ہے۔ لیکن مصنفہ نے اسے قصہ کہانی کی شکل میں پیش کر کے دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس کتاب میں قدیم زمانے کی باتیں، تہذیب و تمدن، معاشرت و رسم و رواج کو پیش کر کے ان میں تبدیلیاں اور ان کی موجودہ حالت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ انسان کے تہذیب ارتقاء کہانی ہے۔ اس کے اثر واقعات حقیقی ہیں۔ محترمہ آصفہ نے کئی کہانیاں لکھیں ۔ جو جرائد کی زینت بنیں، خرگوش کی چال، اس نے کیا کہ نہ جانا، ایک ہوجاؤ، کون بڑا، لومڑی کی فتح، ان کی کافی دلچسپ کہانیاں ہیں۔

ایک اور اہم نام اے آر خاتون کا ہے۔ ان کا اصلی نام امتہ الرحمن تھا۔ قلمی نام اے آر خاتون، اپنے دو ناولوں، شمع اور تصویر کے باعث کافی شہرت حاصل کی۔ لیکن بچوں کے ادب میں بھی ان کا ممتاز مقام ہیں۔ انہوں نے بچوں کے کئی دلچسپ مختصر و طویل کہانیاں اور ناولٹ قلمبند کیے۔ ان کی تخلیقات ملک بھر کے رسائل، کھلونا، پیام تعلیم دہلی، کلیاں لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوئیں۔ ان کی بیشتر کتب کو مکتبہ کلیاں لکھنؤ نے شائع کیا۔ ان کی بچوں کے لئے کہانیاں ناولٹ سات خیلائیں، سات کھلاڑی، تثین، ساڑھے تین یار، آبشار، شہزادی ماہ رخ، بھائی بہن مکتبہ کلیاں نے اور سلیقہ بیگم اور بربادی بیگم، مکتبہ علم و ادب لکھنؤ نے شائع کئے۔ سلیقہ بیگم اور بربادی بیگم ایک طویل قصہ (ناولٹ) ہے۔ جس کا انداز و اسلوب مولوی نذیر احمد کے ناول مرأۃ العروس کے طرز پر ہے۔ اس میں دو بہنوں کا قصہ ہے ایک سلیقہ مند، تعلیم یافتہ ہے اور دوسری پھوہڑ بے علم ہے۔ ایک اپنی اچھی خصوصیات کی بنا پر اپنے گھر خاندان کی زندگی خوشحالی بنا دیتی ہیجب کہ دوسری اچھے بھلے خاندان کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس میں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت مقصد ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر مولوی نذیر احمد کی کہانیوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے لیکن ان کی کہانیاں بڑوں کے لیے تھیں اور یہ بچوں میں اخلاق اور برے بھلے کی تمیز کے لیے لکھی گئی ہے۔ ان کی کہانی "بھائی بہن" ایک مقبول کہانی ہے۔ جس میں ایک بھائی کی بہن سے محبت کا سبق دیا گیا ہے۔ گویا قدیم روایتی طرز کی کہانی ہے۔ اس کے کردار ایک چڑیا اور چڑا ہے۔ دونوں پیار سے رہتے ہیں۔ چڑیا انڈے دیتی ہے۔ بچے نکلتی ہے۔ دونوں ان کی پرورش کرتے ہیں۔ چڑیا چڑے کی محبت دیکھ کر بادشاہ ملکہ کو رشک آتا ہے۔ چڑیا مرجاتی ہے۔ چڑا دوسری چڑیا لاتا ہے جو بچوں کو مار مار کر گھونسلے سے باہر نکال دیتی ہے۔ ملکہ کو بے حد افسوس ہوتا ہے۔ چڑیا کے دونوں بچے ایک دوسرے کو ہمراہ رہنے لگتے ہیں۔ بعد میں ملکہ کو بھی دو جڑواں بچے بھائی بہن ہوتے ہیں۔ ملکہ کا انتقال ہوجاتا ہے۔ لیکن دونوں بچے مل جل کر رہنے لگتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ہمشیرہ امتہ اللہ تسنیم ۱۸، جون ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئیں۔ اور بعمر میں ۶۸ برس ۱۹۷۶ء میں انتقال ہوا۔ انہوں نے عورتوں بچیوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ کیں۔ انہوں نے ان کے لئے آسان زبان میں قرآنی آیات، احادیث نبوی کے تراجم کیے، تعلیمی تربیتی اصلاحی مضامین لکھے۔ وہ رسالہ رضوان کی مدیرہ رہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے ایک قصص الانبیا بھی لکھی جو چار جلدوں پر مشتمل ہیں۔ یہ دراصل مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب قصص النبیین پر مبنی ہیں۔ اس میں انہوں نے قرآن و حدیث میں انبیائے جو حالات و کوائف، سیرت و افکار و تعلیمات بیان ہوئے ہیں اور حضرت آدمؑ سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک دلکش شیریں و سہل زبان و اسلوب میں پیش

کئے حالات اس میں پیش کئے گئے ہیں۔ یوں تو بچوں کے لئے کئی ادیبو ں نے نبیوں کے قصے تحریر کئے ہیں۔ لیکن اس کتاب کو پڑھ کر بے اختیار منھ سے نکلتا ہے کہ ایں چیز دیگر است امتہ اللہ تسنیم کی بچوں کے لئے کچھ اور مذہبی کتب بھی ہیں۔ جیسے ہمارے حضورﷺ وغیرہ بھی تحریر کیا۔

بانو سرتاج اردو ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ صف اوّل کی افسانہ نویس، ڈرامہ نگار محقق ونقاد ومزاح نگار وغیرہ مانی جاتی ہیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے میں وہ کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ان کا تعلق عمر بھر تدریس وتعلیم سے رہا ہے۔ اس لئے وہ بچوں کی نفسیات، پسند ناپسند ضروریات تعلیم وتربیت کی اہمیت وغیرہ کو بخوبی سمجھتی تھی۔ انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں، ناول، ڈرامے، مضامین، تاریخی کتب وغیرہ لکھی ہیں۔ ان کے بچوں کے لئے ناول جنگل میں منگل کافی پسند کیا گیا ہے۔ اسے ادارہ ادبی دنیا دہلی نے شائع کیا ہے۔ ان کی کئی کہانیاں ڈرامے رسائل میں شائع ہوئے اس ڈرامے سچ کا بول بالا (امنگ، مارچ ۱۹۹۶ء) جب جاگے تبھی سویرا (نرالی دنیا دسمبر ۲۰۰۱ء) اور بوند کا سفر (امنگ اکتوبر ۱۹۹۶ء) ایک بے وقوف کی کہانی (نرالی دنیا اکتوبر ۲۰۰۱ء اپنے لئے جیئے تو کیا جیئے۔ (نرالی دنیا مارچ ۲۰۰۲ء) کہانیاں دلکش ہیں۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ ایک بیمار سوانار، اور شیر کی دھاڑ کافی مقبول ہونے کے اس کے علاوہ ان کے ڈرامے کافی سبق آموز ہوتے ہیں۔ شیر کی دھاڑ، جنگل کی کہانی ہے۔ جس میں شیر بندر وغیرہ کردار ہیں۔ مل جل کر رہنے کا سبق دیا گیا ہے۔ مجھے شکایت ہے میں بچوں کی ماں باپ سے شکایت پر مبنی ہے۔ انگریزی کا بھوت میں انگریزی کے بے جا استعمال پر طنز ہے۔ شرط منظور ہے میں بچوں کی امتحان کی تیاری کا ذکر ہے۔ وطن کیلئے اس کتاب میں وطن کے لئے (ٹیپو سلطان کا قصہ) ایک سے بڑھ کر ایک (سکندر اعظم اور ایک ہندوستانی عالم کا واقعہ) کہیں دیر نہ ہو جائے (جہانگیر کے انصاف کا واقعہ ایک گھوڑے کو انصاف دلانے کا واقعہ) فقیر کی نصیحت (محمود غزنوی اور فقیر کا قصہ) عدل اکبر (اکبر کا انصاف) اور گالیاں گالیاں (ایک انگریز کا واقعہ) ہیں۔ بانو سرتاج جنگل میں منگل، انسان اور جانوروں کے مل جل کر رہنے اور محنت کشی لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ ایک لڑکی کی ہنرمندی بیان ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ بشریٰ نیّر نے بچوں کے لئے تاریخی واقعات پر مشتمل مضمون 'تاریخ کے جھروکے سے' لکھا ہے۔ بلقیس ظفیر الحسن نے بچوں کے لئے کئی کہانیاں لکھیں جو رسائل میں شائع ہوا۔ بیگم ممتاز مرزا بھی بچوں کے لئے لکھتی رہتی تھیں۔ ان کی کہانیاں وغیرہ رسائل میں شائع ہوتا رہا اس کے علاوہ امتہ الرحمن کا ایک ناول پانچ جاسوس، پیام تعلیم دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا ہے۔ اس میں پانچ ہوشیار بچے شوقیہ طور پر جاسوسی کو اختیار کرتے ہیں اور مختلف پراسرار باتوں کی کھوج لگاتے ہیں۔ ناول بچوں کے لئے تھوڑا مشکل لگتا ہے۔ تبسم نشاط کی کہانیوں کا مجموعہ بازگشت (۱۹۸۷ء) اور نھا مجاہد (۱۹۸۷ء) مکتبہ الحسنات رامپور نے شائع کیا ہے۔ ان میں ان کی اخلاقی کہانیاں شامل ہیں۔ تسنیمہ حیدر کی کہانیوں کا مجموعہ نٹ کھٹ چنو، بچوں کا ادبی ٹرسٹ دہلی، نے ۱۹۸۹ء میں شائع کیا تھا۔ یہ کتاب سائنس سیریز کے تحت شائع کی گی تھی۔ یہ دراصل بادلوں کی معلومات پر مشتمل ہے۔ لیکن اسے مصنفہ نے کہانی کے انداز میں پیش کر کے اسے بچوں کے لئے دلچسپ بنا دیا ہے۔

ثریا صولت ودربھ کی مشہور شاعرہ اور افسانہ نویس ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے کئی کہانیوں لکھیں ہیں۔ جو ایک کتاب پتھر کی گڑیا میں شائع کی گئیں۔ اس میں ان کی یہ کہانیاں ہیں۔ پتھر کی گڑیا، خوشی کا راز، امن کا قافلہ، چالیس چور، سیب والی تھالی، بھولا آصف، کیل اور غلاف، ان کی ایک اور کتاب خفیہ سرنگ میں چار مہماتی کہانیاں ہیں۔ خفیہ سرنگ، علیم آباد کا قلعہ، عاصم کی تلاش، انوکھا گونگا (۱۹۷۱ء) ان کی کتاب پہاڑی مہم میں دو مہماتی کہانیاں ہیں۔ (۱۹۹۳ء) پہاڑی مہم اور ایٹمی چوری، اس طرح ان کی کتاب تین دوست (۱۹۹۱ء) میں تین دوست اور خفیہ پیغام اور ویرانے کا بھوت، کہانیاں ہیں۔

ثریا فرخ کی کہانیاں ہندوستان پاکستان دونوں جگہ شائع ہوئی ہیں۔ مکتبہ پیام تعلیم دہلی نے ان کی درج ذیل کتابیں شائع کی ہیں۔ سونے کی چوری، اور سنہری جھیل ان کے نام ہیں۔ یہ دونوں ناولٹ ہیں۔ سونے کی چوری ایک جاسوسی قصہ ہے۔ جس میں مہم جوئی اور شجاعت کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ سنہری جھیل ۲۳۔ ابواب پر مشتمل ایک طویل قصہ ہے۔ اس میں کچھ بچے ایک سنہری جھیل کی تلاش میں نامعلوم مقامات پر سفر کرتے ہیں۔ جنگل پہاڑ ندیوں کو پار کرتے ہیں طرح طرح کی پراسرار جانوروں وغیرہ سے ان کا سابقہ ہوتا ہے۔

جیلانی بانو بحیثیت ایک فکشن نگار، افسانہ و ناول نگار اردو ادب کی نہایت مشہور و معتبر خاتون ہیں۔ انہوں نے بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے بھی کچھ لکھا ہے۔ ان کی بچوں کے لئے کہانیاں اور مضامین رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ جھوٹا سچ (ماہ نامہ کھلونا دہلی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء) اور احمق پور کا احمق مند (کھلونا فروری ۱۹۷۵ء) ان کی ایسی کہانیاں ہیں جو بچوں کے کہانی ادب کے ساتھ ان کے لئے طنز و ظرافت پر مشتمل ادب کی کمی کو بھی پورا کرتی ہیں۔ اس میں انہوں نے واقعات حالات کوائف، ماحول، کرداروں ان کے اعمال افعال گفتگو وغیرہ کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے۔

حجاب امتیاز علی کا نام بھی بچوں کے ادب کے سلسلے میں نمایاں ہے۔ انہوں نے بڑوں کے لئے تو کافی لکھا بچوں کے لئے بھی ان کا قلم خاموش نہیں رہا۔ ان کے خسر اور شوہر کا ادارہ دارلاشاعت پنجاب لاہور اور ان کی خوش دلھن، محمدی بیگم اور شوہر امتیاز علی تاج بھی اس ادب میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کا ادب اطفال کا عہد ساز اور سنگ میل جدید پھول اردو ادب الاطفال کا ایک درخشاں ستارہ کہا جاسکتا ہے۔ حجاب نے بچوں کے کئی کہانیاں لکھیں۔ مضامین لکھے۔ ڈرامے لکھے۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ چچا بھتیجیاں مشہور ہے۔ ان کی کئی کہانیاں بڑی مقبول ہوئیں۔ طوطے کا پنجرہ، شہزادہ گل رخ، الہ الدین کا چراغ، وغیرہ چند نام ہیں۔

خالدہ رفعت کی کہانیاں کامکس کی شکل میں بھی شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تین کہانیاں کافی مقبول ہوئیں۔ بیگن بادشاہ زادی، غزالہ ہاشمی کی کہانی، ماں کی نصیحت۔ خدیجہ مستور اردو کی مشہور افسانہ و ناول نویس گذری ہیں۔ ان کی کئی کہانیاں رسائل میں شائع ہوئیں۔ بدلہ (کھلونا، اکتوبر ۱۹۸۵ء) ضد کا انجام (ماہ نو لاہور، نومبر ۱۹۷۹ء) وغیرہ قابلِ ذکر کہانیاں ہیں۔ رضیہ سجاد ظہیر مشہور ادیبہ ہیں۔ افسانہ نگار گذری ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے کئی کہانیاں، مضامین اور معلوماتی کتابیں لکھی ہیں۔ سوانح عمریاں، وغیرہ لکھی ہیں۔ ان کی طبع زاد کہانیوں میں ولی عہد (کھلونا، فروری ۱۹۵۵ء) سنگیت کا رنگ (کھلونا، جنوری ۱۹۶۵ء) ننھا مہاوت (پیام تعلیم، جنوری ۱۹۷۰ء) ستارے کہاں (پیام تعلیم، نومبر ۱۹۷۲ء) شامل ہیں۔ ان کی طویل کہانی ولی عہد ماہ نامہ کھلونا میں فروری ۱۹۵۷ء تا مئی ۱۹۵۷ء قسطوں میں شائع کی گئی ہے۔ ان کی کہانی صبر شہزادہ ایک لوک کتھا پر مبنی ہے۔ انہوں نے ایک تاریخی کتاب سلطان زین العابدین بڈ شاہ مکمل جو تاریخ و کہانی کا امتزاج ہے۔ اس طرح ان کے ترجمے، ہماری ندیوں کی کہانی، بہت دن ہوئے، جنت کی سیر، نہرو بال پستکالیہ نے شائع کی ہیں۔

صالحہ عابد حسین کا تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کے معماروں میں سے ڈاکٹر سید عابد حسین سے رہا ہے۔ ان کی بچوں کے ادب کی خدمات کے بارے میں زیادہ کچھ کہنے کہی ضرورت نہیں۔ اس ادارے اور اس سے منسلک ادیبوں معلمین وغیرہ نے بچوں کے ادب کی نہایت گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ صالحہ نے بڑوں کے لئے تو کئی ناول، افسانے، ڈرامے، سوانح عمریاں اور مضامین وغیرہ لکھے۔ لیکن بچوں کے لئے بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے بچوں کے لئے کہانی ادب اور دیگر قسم کا ادب دونوں پیش کئے ہیں۔ ادبی معلوماتی مضامین لکھے ہیں۔ حالی کی بچوں کے لئے ان کی سوانح عمری مشہور کتاب ہے۔ ان کی کئی کہانیاں رسائل کی زینت بنیں۔ بچوں کے لئے ان کی ادبی و معلوماتی مضامین کافی اہم ہیں۔ دستکاری (پیام تعلیم فروری ۱۹۳۷ء) شملے کی سیر (پیام تعلیم، مئی ۱۹۳۷ء) شملے کے لئے (اگست ۱۹۳۷ء) اُس کا برتاؤ (۱۹۴۵ء) کشمیری بچے (نومبر ۱۹۵۱ء) راشٹر پتی (پیام تعلیم نومبر ۱۹۵۴ء) مولانا حالی بچوں کے ساتھ (اکتوبر ۱۹۶۵ء) بال پین (مارچ ۱۹۶۸ء) بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے۔ (۱۹۷۵ء) قومی خدمت (جنوری ۱۹۷۵ء) دلچسپ تحریریں ہیں۔ سندر چنار، ایک دیس ایک خون، ان کی ایسی کتابیں ہیں جو بچوں میں قومی یک جہتی، قومی یگانگت کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔ باپو۔ مہاتما گاندھی کی سوانح عمری ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی۔ حالی کی سوانح عمری ہے۔ ان کی کتابیں میں بڑا پانی لیلہ مجمدار کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ مورا ملک راج آنند کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ زعفران پریوں کے دیس میں کشمیر پر کتاب ہے۔ انوہا اور کالا کنواں فلپائن کی کہانی ہے۔ ہیم کماری ایک برف کے ٹکڑے کے ہمالیہ سے سمندر تک کے سفر کی کہانی ہے۔ بھولی نجمہ، جادو کا ہرن وغیرہ بھی ان کی کہانیاں ہیں۔ صالحہ عابد حسین کی کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کی ہیں کچھ کتابیں قومی کونسل دہلی وغیرہ نے بھی شائع کی

ہیں۔صغریٰ مہدی مشہور استاد، ناول نگار افسانہ نگار ادیبہ ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے بھی لکھا ریلی کہانیاں ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ عائشہ خاتون کی ایک کتاب چلڈرنس بک ٹرسٹ دہلی، ۱۹۹۹ء میں شائع کی ہے۔ اس میں جو کہانیاں شامل ہیں۔ وہ یا تو انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں۔ یا تلخیص یا اخذ (Adoption) ہیں۔ ادب الاطفال ایک عالمی ورثہ ہے۔ وہ کسی بھی زبان کا ہو۔ بچوں کے لئے اس کے افادیت و اہمیت مسلم ہے۔ اس میں درج ذیل کہانیاں شامل ہیں۔ سونے کا دل، پاؤں کا پھندا، لیمپ کا کارنامہ، کتوں کی ہڑتال، کایا پلٹ، اسکول رپورٹ، گاؤں کے مہمان، پیدائشی جاسوس وغیرہ۔

عصمت چغتائی اردو کی مشہور و معروف و عظیم فکشن نگار گذری ہیں۔ وہ صف اول کی افسانہ نگار و ناول نگار تھیں۔ ان کی کہانیاں اور بچوں کے ناول مقبول ہیں۔ ان کی کہانیوں میں روزمرہ کے حقیقی و دلچسپ واقعات جن کا تعلق عموماً بچوں کی زندگی سے ہوتا ہے پیش ہوئے ہیں۔ ان سے بچوں کو تفریح طبع کے ساتھ زندگی کے تجربات و سبق بدحاصل ہوتے ہیں۔ عصمت کی کہانیوں میں سفید جھوٹ، (کھلونا، ستمبر ۱۹۶۵ء) شیر کی ماں (فروری ۱۹۷۶ء) بلّی کا کرشمہ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) قدرت کا مذاق (کھلونا، فروری ۱۹۷۵ء) دلچسپ ہیں۔ ان کا ناول تین اناڑی بچوں کے ادب کا شاہکار مانا جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے بچوں، بلو ٹیٹو اور کوکی معصوم شرارتوں کا بیان کیا ہے۔ یہ کبھی تو ایک ناٹک یا ڈرامہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور کبھی چاکلیٹ یا مٹھائی بنا کر پیسہ کمانا چاہتے ہیں۔ ان میں شوخی ہے۔ ظرافت ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ ہے۔ ہر بات جاننے کی خواہش ہے۔ وہ انکم ٹیکس کے بارے میں بھی جاننا چاہتے ہیں۔ ان کے پلنگ کے نیچے سرکس کے شیر کے آجانے کا واقعہ بڑا پر لطف ہے۔ ان میں ہمدردی کا شدید جذبہ ہے۔

قدسیہ زیدی بچوں کی بڑی مصنفہ گذری ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے بڑے اہتمام کے ساتھ کتابیں لکھیں۔ انہیں تصاویر سے مزین کروایا اور بڑے اہتمام کے ساتھ جلی حروف میں شائع کروایا۔ انہوں نے اس دور کے ادب الاطفال کی تمام اصناف، شاعری، ڈراما، ناول، مضامین، باتصویر کہانیاں سبھی میں خدمات انجام دیں قومی یک جہتی، حب الوطنی، عصری آگہی، کے عناصر کو مدنظر رکھا۔ خود بھی کتابیں لکھیں اور ترجمہ بھی کیں، ان کی کتاب سرخ جوتے چھوٹے بچوں کے لئے ہے تو جان باز سپاہی (چیونٹوں پر) بھن بھن بانو (شہد کی مکھی پر) ان تھک جان، گلابو چوہیا اور غبارے، کیسے چکمہ دیا، انوکھی دوکان، منی کی مانو، دنیا کے جانور بڑوں کے لئے، گاندھی بابا کی کہانی سوانح حیات ہے۔ ان کی کتابوں کو مکتبہ پیام تعلیم دہلی، کتابی دنیا دہلی، اور نیشنل بک ٹرسٹ نے ڈاکٹر ذاکر حسین سیریز کے تحت شائع کیا ہے۔ انہوں امتیاز علی تاج کے مزاحیہ کردار چچا چھکن کو مرکزی کردار بنا کر چچا چھکن کے کارنامے کے عنوان سے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ان کے مضامین جو سوانحی، تفریحی اور معلوماتی نوعیت کے ہیں۔ رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ پیام تعلیم میں یہ مضامین ملتے ہیں۔ کچھ پرواہ نہیں (ستمبر ۱۹۴۶ء) راشٹر پتی (نومبر ۱۹۵۴ء) نئے فنکار (مارچ ۱۹۵۴ء) شیر دادا (جنوری ۱۹۵۴ء) وغیرہ۔

قرۃ العین حیدر کی قلم فرسائی کا آغاز ہی بچوں کی ایک کہانی، بی چوہیا کی کہانی، مطبوعہ پھول لاہور سے ہوا تھا۔ وہ بطور ایک افسانہ نگار و ناول نگار بہت عظیم ادیبہ مانی گئی ہیں۔ گیان پیٹھ ایوارڈ حاصل کرنے والی پہلی اردو ادیبہ ہیں۔ انہوں نے کچھ کہانیاں تو خود لکھیں۔ اور کئی کہانیوں، ناولوں وغیرہ کا ترجمہ دیگر زبانوں کے ادب سے کیا۔ ان کا مشہور ناول جن عبدالرحمٰن روسی مصنف ایل لاگن کے ناول اولڈ جنّی ختا بچ کا ترجمہ ہے۔ انہوں نے روسی مصنف اوپیروفکایا کی متعدد کتابوں کا ترجمہ نہایت رواں دواں بے ساختہ اردو میں کیا۔ ان کی کتابوں جانوروں کو کردار بنا کر کہانی کے انداز میں ان کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی تھیں۔ بھیڑیئے کے بچے، شیر خان کے بچے میاں ڈھنچو کے بچے، ہرن کے بچے، لومڑی کے بچے، بہادر وغیرہ، بہادر ایک پھرتیلے گھوڑے، کی کہانی ہے جو اپنے مالک کی جان بچانے کے لئے برف میں دھنس جاتا ہے۔ لیکن مالک صحیح سلامت باہر نکل آتا ہے۔

قمر قدیر ارم بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ ساتھ ہی بچوں کے ادب پر کام بھی کرتی ہیں۔ انہوں نے طبع زاد کہانیوں کے ساتھ ساتھ روایتی کہانیوں کو بھی جدید انداز میں پیش کیا ہے۔ شفیقہ فرحت اردو کی مشہور مزاح نگار خاتون گزری ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ مضامین، ڈرامے، افسانے، وغیرہ اسی رنگ میں لکھے ہیں۔ ان کا ادب الاطفال میں بھی کافی اہم یوگدان (حصہ) ہے۔ انہوں نے ناگپور سے

بچوں کا ایک رسالہ کرنیں جاری کیا تھا۔ وہ اس کی مدیرہ تھیں۔ اور اس میں انہوں نے بچوں کے لئے کافی کچھ لکھا بھی ہے۔ افسوس کہ اردو دنیا کی ناقدری کے باعث یہ جاری نہ رہ سکا۔ ورنہ پھول کلیاں، پیام تعلیم، نونہال، امنگ وغیرہ کی طرح یہ بچوں کے رسائل کا ایک درخشاں ستارہ ثابت ہوتا۔ شفیقہ بچوں کے لئے کہانیاں، ڈرامے فیچرز، اور معلوماتی و ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان کی کہانیاں، چوں چوں بیگم نامی کتاب میں شائع ہوئی ہیں۔ اسمیں ۴ کہانیاں ہیں۔ انہوں نے ماحولیات کے موضوع پر ایک ٹکڑا بادل بھی لکھا ہے۔ انہوں نے بچوں کے لئے بچوں کے نظیر اکبر آبادی نامی ایک مدنظر رکھ کر بچوں کی شفیقہ فرحت ایک کتاب بھی شائع کی ہے۔ طوطے کی آزادی، چوں چوں بیگم، معمولی کتا، مڑ اور مسٹر مٹر، لال وغیرہ ان کی کہانیاں دلچسپ ہیں۔

شبنم قادری بھی بچوں کی ادیبہ ہیں۔ ان کی کہانیاں اور کہانیوں پر مشتمل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ انہوں نے مذہبی قصص پر مشتمل کہانیاں لکھی ہیں۔ جیسے ہاتھی کی فوج، کوے کی قبر، جنت کا پھل، لاٹھی کا سانپ وغیرہ، اسی طرح شہناز اختر کی کتاب، غریب شہزادہ، نسیم بک ڈپو نے ۱۹۷۷ء میں شائع کی ہے۔ اسمیں ایک شہزادے کی کہانی ہے۔ شیریں نیازی کی کہانیوں کی کتاب آدمی چڑیا اور کانٹا۔ گیارہ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ نالائق، راجو، چیکو، میکو، جھوٹ کی بول، خوبصورت ہاتھ، برکت کا پھول، منٹو اور آٹلو، کوئلہ کی کان، وغیرہ۔

عطیہ پروین کا شمار عہد حاضر کی مقبول افسانہ نگار ناول نویس خواتین میں ہوتا ہے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لئے متعدد کہانیاں، نظمیں فیچرز، ڈرامے لکھے۔ ان کی ابتدائی کہانیاں ماہ نامہ کلیاں لکھنو میں شائع ہوئیں۔ بعد میں انہیں مکتبہ کلیاں لکھنو نے کتابی شکل میں شائع کیا۔ شب نور، فاختہ شہزادی جنت کی تلاش، ننھے میاں نے کھیر کھائی، قابل ذکر کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی تخلیقات کھلونا، پیام تعلیم، امنگ بچوں کی نرالی دنیا، ہلال، وغیرہ میں شائع ہوئی ہیں۔ ابا کہتے تھے ان کی اپنے طرز کی کہانیاں ہیں۔ عذرا یوسفی کی کچھ کہانیوں کی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں۔ جیسے بہادر دوست، وغیرہ۔ عقیلہ بانو ادب الاطفال میں کامکس کہانیوں کے ذریعے، شناخت رکھتی ہیں۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کو کامکس (کارٹونوں) کے ذریعے پیش کر کے اردو کامکس میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے کامکس کی فہرست طویل ہے۔ ان کے کامکس رسائل میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ جیسے ماہ نامہ امنگ میں نوری (اپریل ۱۹۹۶ء) انوکھا باغ (ستمبر ۱۹۹۶ء) سنہرے جنگل کی بولی (مارچ ۲۰۰۲ء) نصیحت (دسمبر ۲۰۰۱ء) ناگ راج (جنوری ۱۹۹۹ء) کر بھلا تو ہو بھلا (دسمبر ۱۹۹۹ء) میں۔ اس کے علاوہ دہلی اردو اکادیمی نے انکے کامکس پر مشتمل دو کتابیں انوکھا باغ اور کپاس بادل، کتابی شکل میں بھی پیش کی ہیں۔

مشہور افسانہ و ناول نگار خاتون واجدہ تبسم نے بچوں کے ادب میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر کہانیاں، مزاحیہ فیچر اور معلوماتی مضامین لکھے۔ ہمارے چچا (کھلونا، فروری ۱۹۵۶ء) ہماری زندگی (کھلونا، اکتوبر ۱۹۵۷ء) مزاحیہ ٹیچر ہیں۔ بہنوں کے لئے کھلونا نومبر ۱۹۵۸ء) لڑکیوں کے لئے کھانے پکانے کشیدہ کاری وغیرہ کے ہنر سے متعلق ہیں۔ ان کی رسالہ کھلونا دہلی میں شائع شدہ چند کہانیاں یہ ہیں۔ کہاں اور کیوں (فروری ۱۹۵۷ء) مسٹر توڑ پھوڑ (جنوری ۱۹۵۸ء) بچوں کا بادشاہ (اکتوبر ۱۹۵۸ء) نیا نوکر (جنوری ۱۹۶۵ء) چھپی ہوئی دولت (فروری ۱۹۷۶ء) وغیرہ ان کی قومی یک جہتی پر کہانیوں کا ایک مجموعہ پھول کھلنے دو ہے جو چھوٹے بچوں کے لئے تو نہیں البتہ بڑی عمر کے لڑکوں کے لئے مناسب ہے۔

ترنم ریاض عہد حاضر کی مشہور شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ وہ بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ ان کی کتاب سنو کہانی، ان کی لکھی کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں ترجمہ بھی کی ہیں۔ گوسائیں باغ کا بھوت، اور ہاؤس بوٹ پر بلی، دو کتابیں ہیں ساہتیہ اکادمی دہلی نے ۱۹۹۶ء میں شائع کیں۔ ترقی اردو بورڈ نے ان کی ایک کتاب بھوت پریت، تعلیم بالغاں کے سلسلے میں شائع کی ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی بمبئی نے بچوں کے لئے فارسی کی مشہور کتاب انوار سہیلی سے کہانیوں کو منتخب کر کے ان کا سلیس وسادہ و دلکش زبان میں ترجمہ کر کے لکھا ہے۔ یہ حکایات جانوروں پر پرندگان ہیں۔ انوار سہیلی کا ماخذ پنچ تنتر کا عربی ترجمہ کلیلہ ودمنہ ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن انمول کہانیاں شائع ہوا ہے۔ زیب النساء بیگم کا نام بچوں کے ادب میں ناقد کی حیثیت سے شامل ہے۔ انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں وغیرہ تو نہیں

لکھیں لیکن بچوں کے ادب پر مشیر فاطمہ کی طرح کام کیا ہے۔ان کی کتاب اقبال اور بچوں کا ادب ایک نظریاتی تنقیدی کتاب ہے۔اس میں یہ ابواب ہیں۔ بچوں کے ادب کی ضروریات، بچوں کے ادب کی خصوصیات، اردو میں بچوں کا ادب، اقبال اور بچے، بچوں کے ادب کا مطالعہ۔زینب نقوی تقریباً ۳ دہائیوں سے مستقل لکھ رہی ہیں۔اور اردو ہندی دونوں میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔انہوں نے بچوں کے لئے کہانیاں، ڈرامے، مضامین اور فیچرز لکھے ہیں۔بچوں کے ناول نگاروں میں سیدہ اعجاز کا نام بھی شامل ہے۔وہ اپنے مشہور ناول، مونگے کے جزیرے کے ذریعے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ بچوں کا دلچسپ ناول پہلے نسیم بک ڈپو کے رسالے کلیاں، لکھنو میں قسط وار شائع ہوا تھا۔بعد میں اسے نسیم بک ڈپو نے کتابی شکل میں شائع کیا۔یہ ایک مہماتی ناول ہے۔ جس میں ایک سمندری سفر کا قصہ ہے۔ایک جہاز پر کئی مرد عورتیں اور بچے سمندر کی سیر کو نکلتے ہیں۔اور مونگے کے جزیروں (کورل ائی لینڈ) پہنچتے ہیں۔ جہاں انہیں عجیب وغریب جانداروں اور حالات سے سابقہ پڑتا ہے۔ یہ ناول دراصل انگریزی ناول نگار آر۔ایم بلنطائن کے ایک ضخیم مہماتی ناول (ایڈونچر ناول) سے ماخوذ ہے۔لیکن مصنفہ نے اسے (Adopt) کیا ہے۔اور اس طرح کہ اس قصہ کو مختصر بھی کیا اور اپنے ملک کے ماحول کردار، رسوم ورواج کو اس میں داخل کر دیا اور کئی باتوں کا اپنی جانب سے اضافہ بھی کر دیا۔یہ ناول غیر ملکی معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ طبع زاد سا لگتا ہے۔(مصنفہ، نسیم بک ڈپو ص ۲)۔ایک اور اہم نام شبانہ کا ہے گذشتہ کئی سالوں سے بچوں کے لئے لکھ رہی ہیں۔ان کے مضامین، فیچرز، کہانیاں وغیرہ بچوں کے رسائل میں نظر سے گذری ہیں۔انہوں نے کئی تحریروں میں شخصیات و ماحولیات کو موضوع بنایا ہے۔ان کا مضمون، سر سید احمد خاں کی والدہ کافی پسند کیا گیا تھا۔ان کی کہانیاں بھی دلچسپ ہیں۔ایک خوبصورت جھیل کی کہانی، کہانی کی شکل میں ایک جھیل کا نقشہ ہے۔انہوں نے ایک کتاب جنگ آزادی کی بہادر عورتیں لکھیں جس میں مہارانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل وغیرہ کے حالات پیش کئے گئے ہیں۔

شہناز نبی نے بچوں کے بنگالی ہندی وغیرہ زبانوں سے ڈراموں کا ترجمہ کیا ہے۔ان کا ایک مجموعہ بچوں کے ڈرامے، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ نے نومبر ۱۹۸۹ء میں شائع کیا تھا۔اس میں چھ نامور ڈرامہ نویسوں کے ڈرامے شامل ہیں۔جن کے عنوانات مع مصنفین یہ ہیں۔ ٹیگور (بیمار کا دوست) سوکمار رائے (حاسد) سویرمل بسو (مشکل آسان) اناداشنگر رائے (افواہ) مہیر سین (انجمن دختران لاپروا) رودراپر ساد چکرواتی (پرومیتھوس کی سزا) بنگالی ڈرامے اپنے اصل کرداروں کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔زبان بیان معلومات سب بچوں کے لئے مناسب اور پسند ناپسند کو ملحوظ رکھ کر لکھا گیا ہے۔فہمیدہ عتیق کی کتاب ننھا فرشتہ مکتبہ پیام تعلیم دہلی نے شائع کی ہے۔یہ کہانیوں کا مجموعہ ہے۔اس میں دس دلچسپ کہانیاں ہیں۔پرانے جوتے کی آپ بیتی، آگ کا پرندہ، لال فراک، کام کی بات، خالو امید علی۔۔۔

کشور ناہید اگر چہ پاکستان میں رہتی ہیں۔لیکن اصلاً ہندوستانی ہیں۔یہیں پیدا ہوئی تھیں۔تقسیم کے بعد پاکستان چلی گئیں۔وہ بحیثیت شاعرہ مشہور ہیں۔لیکن انہوں نے بچوں کے لئے کئی کہانیاں لکھی ہیں۔اور نثر کے ساتھ منظوم کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ منظوم حکایات کی روایت ہمارے ادب الاطفال میں کافی ہے۔مولوی محمد اسماعیل میرٹھی وغیرہ کئی ادیبوں نے منظوم کہانیاں لکھی ہیں۔کشور ناہید نے گدھ نے بنسری بجائی، بطخ اور سانپ اور کتے اور خرگوش، آنکھ مچولی، مینڈک اور مرغی، چڑیل اور کوئل، کہانیاں لکھ کر ایک نیا تجزیہ جدید دور میں کیا ہے۔ان کی مشہور کہانیاں جو ہندوستان میں بھی شائع ہوئی ہیں یہ ہیں۔جادوئی ہنڈیا، بارہ مہینے، شبنم کا تاج، نیک دل دیو، خرگوش اور لومڑی، شیر اور بکری، ہیروں کا سیب، شہزادے سورج مکھی، گدھ کے کانوں والا شہزادہ، چاند کی بیٹی، تین جھوٹے اور ایک سکّہ، سونے کی کلہاڑی، مالن اور کمہاری، بڑھیا اور مرغا، خزانہ، قسمت کی بات، نیولے اور بلی، لومڑی اور بندر، غریب موچی، دو چوہے، لالچی ریچھ، ان کو ہندوستان میں مکتبہ پیام تعلیم نے شائع کیا ہے۔

کشور جہاں کی کہانی کی کتاب خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا (پیام تعلیم، دہلی ۱۹۸۲ء) تحیر خیز کہانیوں پر مشتمل ہے۔مشیر فاطمہ کی اردو ادب الاطفال میں افسانوی ادب کے لحاظ سے اہمیت نہیں۔ بلکہ بچوں کے ادب کی ناقد کی حیثیت سے ہے۔ان کی کتاب بچوں کے ادب کی خصوصیات (انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ ۱۹۶۲ء) ایک اہم تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے۔جس میں بچوں کے ادب کی نوعیت خصوصیات قدر قیمت پر

روشنی ڈالی گئی ہے۔ بچوں کا ادب کیا ہے۔ بچوں کے ادب کی ضرورت و مسائل کیا ہیں۔ ادب الاطفال کی بنیادی خصوصیات کیا ہے۔

بچے کیا پسند کرتے ہیں کیا نہیں کرتے۔ بچوں کے لئے اچھی کتاب ہے۔ بچوں کے ادب پر تنقیدی نظر وغیرہ مباحث کا اس کتاب میں احاطہ کیا گیا ہے۔

مہر رحمٰن ایوت محل برار کی رہنے والی ہیں انہیں فن ڈراما سے دلچسپی ہے انہوں نے بڑوں اور بچوں دونوں کے لئے ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کی کتاب فن کی قیمت بڑوں کے ڈراموں پر مشتمل ہے۔ اور بازیچہء اطفال بچوں کے لئے ڈراموں پر۔ ان کے ڈرامے پہلے رسائل میں شائع ہوئے، ہائے میں کیا کروں، اشتہاری ملازم، خیر سے بدھ گھر کو جائیں، کایاپلٹ، اف یہ کورس، پڑھنے کا یہاں دستور نہیں، نواب صاحب کی حویلی، فن کی قیمت، تین زاویے، چنگی کی کرامت ان کے ڈرامے ہیں۔ انہیں بچے پڑھ کر بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اور انہیں بہ آسانی اسٹیج کر سکتے ہیں۔

نور جہاں نوا بچوں کے لئے مستقل لکھنے والیوں میں ہیں۔ ان کی تخلیقات، پیام تعلیم، امنگ، نرالی دنیا، اور دیگر جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انہوں نے مختلف اصناف اور متنوع موضوعات میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ شاعرہ بھی ہیں۔ اور نثر نگار بھی، ان کی نمایندہ کہانیاں یہ ہیں۔ ظلم کی سزا (بچوں کی نرالی دنیا نومبر ۲۰۰۱ء دولت کے کھیل، طویل کہانی (نرالی دنیا جولائی ۲۰۰۱ء) بڑوں کے جھگڑے (نرالی دنیا ستمبر ۲۰۰۱ء) ایمانداری کا صلہ (نرالی دنیا مئی ۲۰۰۲ء) دامنی (نرالی دنیا جولائی ۲۰۰۳ء) خدا کی لاٹھی طویل کہانی (نرالی دنیا جنوری ۲۰۰۲ء) وغیرہ۔

ان کے علاوہ بھی کئی خواتین نے بچوں کے لئے کہانیاں، ڈرامے، مضامین وغیرہ لکھے ہیں۔ یہ کم تعداد میں ہیں اور بیشتر کسی رسالہ میں زینت بن کر رہ گئے ہیں۔ مکتبہ جامعہ دہلی، مکتبہ پیام تعلیم دہلی، مکتبہ کلیاں لکھنؤ، نرالی دنیا دہلی، امنگ دہلی، اداروں اور رسائل میں مختلف قوانین کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، بچوں کے ادب پر خاص توجہ دے رہا ہے۔ اس کے علاوہ نیشنل بک ٹرسٹ دہلی، چلڈرنس بک ٹرسٹ دہلی، نہرو بال پستکالیہ دہلی، ماسکو کا بدیسی زبانوں کی اشاعت کا ادارہ، این سی ای آر ٹی، اور ریاستی حکومتوں کے اشاعتی ادارے بھی اس ادب پر توجہ دے رہے ہیں۔ ان میں بہت سی خواتین کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اردو ادب الاطفال میں خواتین ہند کی خدمات کی قدر و قیمت اہمیت مسلم ہے۔

معین افروز حیدرآباد

غزل

پوچھ رہا ہے بہتا پانی، مجھ سے تھم کر، یہ کیا ہے
کون ہے جس نے ان ندیوں کو دو حصوں میں بانٹا ہے

وہ اک سوکھے پھول کے جیسا میں اک ٹوٹا آئینہ
میں بھی اس کے جیسا ہوں اور وہ بھی میرے جیسا ہے

ننگی آنکھیں اکثر دھوکہ دیتی ہیں بینائی کو
کالا چشمہ اوڑھ کے دیکھو دنیا کالا سونا ہے

دل کرتا ہے چاند کی مٹی پر لکھ دوں میں اس نام
مجھ سے جگنو کہتا تھا کل وہ بھی چاند کے جیسا ہے

جیسے مئی کی گرمی میں برسات ہوئی اولے برسے
پھولوں میں مسکانے والا یوں اشکوں میں ڈھلتا ہے

لفظوں کے انگارے اتنے مت برساؤ تم افروزؔ
میرے اندر میرے جیسا موم کا پتلا رہتا ہے

محمد ارشاد عالم۔ ریسرچ اسکالر، انگلش اینڈ فورین لینگویجیز یونیورسٹی حیدرآباد

عربی اور مغربی ادب میں ادب اطفال کا مختصر جائزہ

اصناف ادب میں ادب طفولہ وہ صنف ہے جو عصر جدید کی پیداوار ہے۔ پہلے یہ مغربی ادب کا حصہ بنا اور پھر دھیرے دھیرے دنیا کے مختلف ادبوں کا حصہ بنتا چلا گیا۔ عربی ادب میں بھی اس صنف نے جلد ہی اپنے پاؤں پسارے اور مستقل ایک فن اور صنف کی حیثیت سے اس میں اپنی شناخت قائم کر لی۔ اس مضمون کے حوالے سے ہم یہاں عربی ادب اور مغربی ادب میں ادب اطفال کی صورت حال کا مختصر جائزہ لینگے۔

عربی ادب میں ادب اطفال کی صورت حال:

جدید عربی ادب میں ادب اطفال کے سلسلے میں ماہرین اور ناقدین کی آراء مختلف نظر آتی ہیں، چنانچہ معروف نقّاد اور ادیب ڈاکٹر علی الحدیدی کے نزدیک عربی ادب میں اس نوع کا سب سے پہلا ادبی شہ پارہ مصر میں امیر الشعراء احمد شوقی کے ہاتھوں ظاہر ہوا جب انھوں نے چند شعری قصائد لکھے مثلاً ''الصیّاد والعصفور''، ''الدیک الھندی'' اور ''الدجاج البلدی''۔

لیکن ڈاکٹر احمد زلط اور ڈاکٹر محمد عبدالغنی حسن کے مطابق اس صنف کا سب سے پہلا ادبی شہ پارہ ۱۸۷۰ سے ۱۸۷۷ کے مابین منصہ شہود پر آیا جسے مجلّہ ''روضۃ المدارس المصریۃ'' نے شائع کیا اور جس میں شعری اور افسانوی مقالات شامل ہیں۔ جبکہ بعض مؤرخین نے عربی ادب میں ادب اطفال کی ابتداء ۱۹۷۵ بتائی ہے اور دلیل کے طور پر رفاعہ طہطاوی کی کتاب ''المرشد الأمین فی تربیۃ البنات والبنین'' پیش کی ہے جس کی اشاعت ۱۹۷۵ میں ہوئی۔ راقم الحروف کے نزدیک راجح قول وہی ہے جو ڈاکٹر احمد زلط اور ڈاکٹر محمد عبدالغنی حسن نے پیش کی ہے، اور اس کی وجہ یہ کہ ''المرشد الأمین فی تربیۃ البنات والبنین'' کے کچھ فصول کی اشاعت مجلّہ ''روضۃ المدارس المصریۃ'' میں ۱۹۷۰ میں ہی ہو چکی تھی۔

لیکن جہاں تک عربی ترجمہ کی بات ہے تو اس سلسلے میں مشہور قصہ نگار اور ڈرامہ نگار شاعر محمد عثمان جلال کو سبقت و ریادت حاصل ہے، ان کی کتاب ''العیون الیواقظ فی الأمثال والمواعظ'' کو بیشتر ادباء اور ناقدین نے ادب طفولہ کی صنف میں اوائل کتب میں شمار کیا ہے۔

دریں اثناء اگر ہم مجلّہ روضۃ المدارس میں لکھنے والوں کا سرسری جائزہ لیں تو یہ اس وقت کے بڑے بڑے ادباء اور شعراء کی تحریروں کی آماجگاہ بن چکا تھا، ان میں قابل ذکر نام یہ ہیں:

رفاعہ طہطاوی، علی طہطاوی، عبداللہ فکری، علی مبارک، صالح مجدی، شیخ حسین مرصفی، حمزہ فتح اللہ، عبداللہ ابو السعود اور محمد عثمان جلال وغیرہ، اور اس وقت کے نوابغ التلامیذ میں محمود وہبی، محمد حشمت، محمود حمدی، احمد نجیب اور اسماعیل صبری وغیرہ قابل ذکر تلامذہ ہیں۔

اس کے بعد ۱۹۰۳ میں علی فکری (۱۸۷۹ ۱۹۵۳) نے اپنی کتاب ''مسامرات البنات'' شائع کر کے ادب اطفال کی سمت میں اپنا رول بخوبی نبھایا۔ پھر ۱۹۱۱ میں ابراھیم العرب کی ایک نئی کتاب منظر عام پر آئی جو ۹۰ شعری

کہانیوں پر مشتمل تھی۔

۱۹۲۳ء میں "لجنۃ التألیف والترجمۃ والنشر" کی جانب سے معروف شاعر محمد الھراوی کے دیوان "سمیر الأطفال للبنات" اور "سمیر الأطفال للبنین" کی تیسری اشاعت ہوئی کچھ زیادتی اور تنقیح کے ساتھ۔ پھر ۱۹۲۶ء کی شروعات میں ہی محمد الہراوی نے اپنی کتاب "السمیر الصغیر" شائع کی جس کے بعد اس فن میں ان کے شعری تخلیقات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

پھر جب ۱۹۲۷ء کا زمانہ آیا تو اس فن کے مشہور ادیب ورائد کامل کیلانی نے اپنا پہلا قصہ "السند باد البحری" کے نام سے شائع کیا، اس کے بعد کامل کیلانی نے بچوں کی کہانیوں کی ایک لمبی سیریز لکھنے کا سلسلہ شروع کیا یہاں تک کہ اس کے لیئے ایک لائبریری بھی قائم کی اور ادب اطفال کو بام عروج تک پہونچایا۔ادب طفولہ میں ان کی بے انتہا خدمات کی وجہ سے عربی ادب میں ان کو اس فن کا رائد قرار دیا گیا۔ محمد الھر اوی نے شعری ڈراموں کے ساتھ بچوں کے لیئے چھوٹے چھوٹے ڈرامائی کہانیاں بھی لکھی جس کی بناء پر وہ بچوں کے شعری ڈراموں کے رائد قرار پائے، ان کے ڈرامائی کہانیوں میں "عواطف البنین"، "حلم الطفل لیلۃ العید" اور "الحق و الباطل" قابل ذکر ہیں۔

علامہ خیر الدین زرکلی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب الأعلام میں لکھا:

" محمد الھر اوي شاعر مصري، انفرد بنوع من النظم السهل، ابتكره للأطفال يحفظونه ويتناشدونه في مدارسهم وبيوتهم "۔

ترجمہ: مصری شاعر محمد الھر اوی سھل نظم نگاری کی صنف میں منفرد ہیں، جس کی تخلیق انہوں نے بچوں کے لیئے کی، بچے اس کو یاد کرتے اور اپنے مدرسوں اور گھروں میں گایا کرتے۔

جدید عربی ادب میں ادب اطفال کی صنف میں دو ادیب بہت مشہور ہوئے، ایک تو محمد الہراوی ہیں اور دوسرے کامل کیلانی ہیں، کامل کیلانی نے ادب اطفال میں اپنی الگ راہ بنائی تو ان کو ادب طفولہ کا رائد مانا گیا۔ کامل کیلانی کے ادبی کارناموں کا ترجمہ دنیا کی متعدد زبانوں میں کیا گیا مثلاً انگریزی، فرانسیسی، روسی، چینی اور اسپینی وغیرہ۔

ڈاکٹر زکی مبارک لکھتے ہیں:

"أشهر المؤلفين في هذا الباب رجلان: محمد الهر اوي وكامل الكيلاني وهما بعيدان عن التدريس"۔

ترجمہ: اس میدان میں دو مؤلف سب سے زیادہ مشہور ہیں محمد الھر اوی اور کامل کیلانی اور دونوں تدریس سے دور ہیں۔

اسی طرح شاعر القطرین خلیل مطران نے کامل کیلانی کی ریادت کے سلسلے میں تحریر فرمایا:

"لو لم يكن للأستاذ الكيلاني من فضل إلا أنه المبتكر في وضع مكتبة الأطفال......، فكفاه فخراً بها، ما قدمه لرفع ماذكره وما أحسن به الى قومه وعصره"۔

ترجمہ: کامل کیلانی کو بچوں کی لائبریری کا واضع ہونے کا شرف نہ بھی حاصل ہوتا تب بھی ان کے فخر کے لیئے وہی کافی تھا جو انہوں نے تحریری شکل میں پیش کیا اور اپنی قوم اور زمانے کے ساتھ احسان کیا۔

اہم رول ادا کرنے والے ادباء:

اس فن کے ماہرین، ادباء اور ناقدین کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ بیشتر عرب ممالک نے ادب اطفال کی تعمیر وترقی اور نشر واشاعت میں اپنا کردار پیش کیا ہے لیکن مصر کو ان پر فوقیت حاصل ہے، اور ادب طفولہ کے میدان میں جو ناقدین، ادباء اور شعراء اپنے ادبی خدمات میں پیش پیش رہے ہیں اور جنہوں نے بچوں کے معاصر ادبیات کا

نقشہ تشکیل دیا ہے ان کے اسماء کی ایک جھلک پیش خدمت ہے:
عبد التواب یوسف ، احمد سویلم ، محمود رضوان ، احمد زلط ، محمود الشنیطی ، حسن شحاتہ ، سید النساج ، کافیہ رمضان ، فیولا البلاوی ، ہادی نعمان الھیتی ، علی الحدیدی ، مصطفیٰ الصاوی الجوینی ، یعقوب الشاروني اور احمد نجیب وغیرہ۔

مغربی ادب میں نئی تحریک بنام ادب اطفال:

عالمی ادب کی تاریخ نئی ادبی تحریکوں سے اکثر و بیشتر متصل رہی ہے۔ یوروپ میں ادب طفولہ کی نئی تحریک جب چلی تو اس سے وہاں کے ادباء، شعراء، قصہ نگار، فلاسفہ اور مفکرین وابستہ ہوئے جنہوں نے بچوں کے لیئے قصے کہانیاں، حکایات اور اشعار لکھ کر اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ بچوں کے لیئے لکھے گئے ان ادبی نصوص کی اشاعت کے لیئے بہت سے مکتبات، ناشرین اور چھاپا خانے وجود میں آئے۔

مشہور ادیب و ناقد ڈاکٹر علی الحدیدی کی تحقیق کے مطابق مغربی ادب میں ادب اطفال تین مراحل سے گزر چکا ہے:

پہلا مرحلہ: پہلے مرحلہ کی شروعات ۱۶۹۷ء سے ہوتی ہے جب ایک فرانسیسی ادیب و شاعر چارلس پیرولٹ (Charles Perrault) نے پاپولر کہانیوں پر مشتمل اپنی کتاب لکھی جو انگریزی میں "The Tales of Mother Goose" کے نام سے مشہور ہے۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہونے کے بعد اس کتاب نے فرانس اور یوروپین ممالک میں ایک نئی ادبی تحریک کو جنم دیا اور وہاں کے ادیبوں کو مجبور کیا کہ وہ ادب اطفال پر بھی اپنی توجہ مرکوز کریں اور اپنی تحریروں کے زریعے اس ادبی صنف کو بام عروج تک پہونچائیں۔

برطانوی پبلشر جون نیوبری (John Newbery 1713-1767) نے چند ماہرین کی مدد سے ڈینیل ڈیفو (Daniel Defoe) کے ناول "روبنسن کروزو" (Robinson Crusoe) اور جوناتھن سویفٹ کی کتاب Gulliver's Travels کا اختصار کر کے شائع کیا۔ جون نیوبری نے اس کے بعد بچوں کے لیئے لکھی گئی قصے کہانیوں کی نشر و اشاعت کا ایک دراز سلسلہ شروع کیا اور اس فن کی تعمیر و ترقی میں ایک اہم رول ادا کیا جس کی بناء پر ان کو "Father of children's literature" کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد بچوں کی کہانیاں لکھنے والے مشہور نثر نگار ادیب لویس کارول (Lewis Carroll) کا زمانہ آیا جس نے ۱۸۶۵ء میں کہانیوں کا ایک مجموعہ "Alice's Adventures in Wonderland" کے نام سے شائع کیا جس کو بہت زیادہ شہرت ملی اور جو ادبی حلقوں میں ان کی شاہکار کا ایک بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ڈنمارک میں ہینز کرسچن اینڈرسن نے "Fairy Tales" کے نام سے اپنا ادبی شہ پارہ شائع کیا اور اس کو اتنی مقبولیت ملی کہ یوروپ میں اس کو ادب اطفال کا رائد تسلیم کیا گیا۔ اس موقع پر روسی شاعر الیگزینڈر پوشکین کو فراموش کرنا ادب کے ساتھ ناانصافی ہوگی جنہوں نے ادب اطفال کے میدان میں اہم رول نبھایا ہے۔

دوسرا مرحلہ:

مغرب میں ادب اطفال کی تاریخ کا دوسرا مرحلہ پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ ۱۹۱۸) کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس دوران ادب طفل پر مشتمل اور ریسرچ میتھڈ پر مبنی کئی علمی تحقیقات اور مطالعات سامنے آئے جو بچوں کے نفسیات، ان کے برتاؤ، عادات و اطوار اور ان کی اہلیت و قابلیت سے متعلق

تھیں۔

تیسرا مرحلہ:

ادب اطفال کی راہ میں تیسرا مرحلہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ ۱۹۴۵) کے اختتام سے شروع ہوتا ہے۔اس مرحلہ میں ادب اطفال اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے مابین حصہ کو ادب اطفال کا سنہرا دور مانا جاتا ہے۔

تیسرے مرحلہ کے دوران ادب اطفال پر بے شمار کتابیں بڑے پیمانہ پر شائع ہوئیں، بچوں کی ادبیات کا اہتمام کرنے والے بہت سے مجلّات، رسالے اور جریدے شائع ہونے لگے، طرق تعبیر میں تنوع پیدا ہوا، لائبریریوں کی تعداد میں اضافہ ہوا، بچوں کی ادبیات نشر کرنے والے چھاپا خانے قائم کیے گئے اور بڑے بڑے جامعات، یونیورسیٹیز اور کالجیز میں داخل نصاب اعلی تعلیم کے مضامین میں ادب طفل کو ایک مستقل مضمون کی حیثیت سے جگہ ملی۔ اس طرح اس فن میں ریسرچ اسکالرز، ناقدین اور ادباء کی کتابیں منظر عام پر آنے لگیں اور ادب طفل ایک مستقل ادبی فن اور صنف کی حیثیت اختیار کر گیا۔

حاصل بحث یہ کہ ادب طفل موڈرن لٹریچر کی پیداوار ہے جس کا ظہور مغربی ادب میں پہلے ہوا، پھر جب عربی ادب کا احتکاک مغربی ادب سے ہوا تو یہ صنف عربی ادب میں داخل ہوا، اور اسی طرح دنیا کے دوسرے آداب میں بھی داخل ہوا جب وہاں کی تہذیب وثقافت کا اتصال مغرب سے ہوا اور پھر یہ عالمی ادب کا ایک اہم صنف بن گیا۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال) ★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دوردراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل "المرأۃ الصالحۃ" ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالمیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

عابد حسین گنائی۔ ریسرچ اسکالر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

جیلانی بانو کی فکشن نگاری

تقسیم ملک کے بعد اردو فکشن کے میدان میں جس نسل نے قدم رکھا اور بہت جلد اپنی انفرادیت اور شناخت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نسل میں جیلانی بانو کا نام بھی کسی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہیں۔ ان کے تخلیقی سفر کی مدت کم وبیش نصف صدی پر محیط ہے۔ ان کی تخلیقات کا کینوس نہایت وسیع ہے ان کے تحریروں میں متنوع موضوعات کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ بڑی معروضیت کے ساتھ اپنے مشاہدات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام تر تخلیقات کے ذریعے سماج کے گوناگوں مسائل اور خصوصاً شہر حیدرآباد کی معاشی، سیاسی فضا اور تہذیبی وثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ان کی پرورش جس ماحول میں وہ خالص ادبی ماحول تھا شاعری انہیں ورثہ میں ملی تھی زندگی کے ابتدائی ایام میں انہیں شاعری اور مصوری کا شوق تھا لیکن بہت جلد ان کا ذہن معاشرے میں پنپنے اور جنم لینے والی برائیوں کی طرح متوجہ ہوا۔ جیلانی بانو ابتدا ہی سے مطالعے کا گہرا شوق رکھتی تھی انھوں نے بچپن سے ہی مشرق ومغرب کے مایہ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا اس ادبی ماحول نے ان کی شخصیت کو نکھارا اور فکر فن کو مزید پختگی عطا کرنے میں مدد کی۔ جیلانی بانو اس حوالے سے لکھتی ہیں:

''میں ہائی اسکول میں تھی جب گورکی، موپاساں، چیخوف، میر امن، عصمت، بیدی، کرشن چندر، فیض، مجاز، قرۃ العین حیدر، اور سعادت حسن منٹو کو پڑھ چکی تھی۔ ان ادیبوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا، بلکہ یہ سب میرے استاد رہے جنھوں نے مجھے فن کی نزاکتیں اور خامیاں سمجھائی ہیں۔ یہ سب وہ ادیب ہے جنھوں نے مجھے کہانیاں پڑھنے اور لکھنے کا شوق دلایا'' (رسالہ نقوش، جیلانی بانو آپ بیتی نمبر، لاہور جون ۱۹۶۴، ص ۶۴)

جس دور میں جیلانی بانو نے ادب کے میدان میں قدم رکھا۔ وہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا دور چل رہا تھا دوسری طرف اردو ادب کے اُفق پر خواتین فکشن نگاروں میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مسرور اور بانو قدسیہ وغیرہ جیسی مایہ ناز اور بلند پایہ صاحب طرز خواتین کا شمار کیا جاتا تھا اور یہ خواتین اپنی تحریروں سے فکشن کی آبیاری کرنے میں محوِ لگن تھے۔ اس طرح ان ممتاز اور مشہور فکشن نگار خواتین کے درمیان اُس وقت اپنی شناخت اور پہچان قائم کرنا زیادہ مشکل تصور کیا جاتا تھا۔ جیلانی بانو نے ان تمام خواتین فکشن نگاروں کی تحریروں کا بغور غائر مطالعہ شروع کیا اور مطالعے کے دوران کسی کے انداز فکر کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا بلکہ جیلانی بانو نے فکشن کے میدان میں اپنی ایک الگ راہ نکالی اور آگے چل کر اس کی خوب آبیاری کی۔

جیلانی بانو نے اردو افسانے کے میدان میں باقاعدہ طور پر اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۴ میں کیا۔ ان کی پہلی تخلیق اور افسانہ ''موم کی مریم'' کے نام سے ۱۹۵۴ میں لاہور سے نکلنے والے ''ادب لطیف'' نام کے مشہور رسالے میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس افسانے میں جیلانی بانو نے درمیانی طبقے

سے تعلق رکھنے والی ایک لڑکی قدسیہ کی روداد کو قلمبند کیا ہیں ۔ دراصل وہ ابتدا ہی سے کسی کا محبت نہ پا کر نفسیاتی کمزوری کا شکار دکھائی دیتی ہے اس طرح وہ محبت کی پیاسی بن جاتی ہے اور اپنے محبت کا اظہار اُس فرد سے کرنا چاہتی ہے جو قدسیہ کی طرح محبت کا پیاسا ہو۔ بالاخر وہ والد کے ٹکڑوں پر پلنے والے ریاض سے اپنے محبت کا اظہار کر لیتی جو بعد میں قدسیہ کو دھوکہ دیتا ہے دوسری بار قدسیہ ایک اسکول ماسٹر سے محبت کر بیٹھی ۔ والد کے کہنے پر اسے بھی چھوڑ دیا تیسری بار اپنے والد جیسے ہم عمر شمیم ماموں کی ویران زندگی میں بہار لانے کی کوشش کی اور آخری بار اپنے چچازاد بھائی اطہر سے بھاگ کر شادی کر لیتی ہیں ۔ اطہر برے عادتوں کا شکار تھا لیکن قدسیہ سے شادی کرنے کے بعد اُسے ان تمام بری عادتوں سے پاک و صاف کر کے ایک کامیاب زندگی دیتی ہے اور خود کو موت کے آغوش میں چلی جاتی ۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مرگئیں! اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہا سکیں' اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہوگا ۔ اطہر سے بھی' تمہیں اپنی شکست پر آنسو نہیں بہانے چاہیے کیونکہ اطہر کو تم نے وہ تحفہ دیا 'جس کے لیے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چھاپ اندھیرے میں کھو گئیں'' (جیلانی بانو' تریاق' موم کی مریم' ص ۴)

اس طرح پورے افسانے میں یہ بات صاف طور پر عیاں ہے کہ قدسیہ نام کی لڑکی جو سچی محبت کی متلاشی تھی وہ اپنی طرف اٹھنے والی ہر نظر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا کرتی تھی ۔ لیکن ہر وقت فریبی اور دھوکے باز مردوں کی نگاہوں کا شکار ہو کر محبت کر بیٹھی ۔ کہیں اُسے سچا محبت نہیں ملا۔

پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۵۸ میں ''روشنی کے مینار'' کے عنوان سے ''نیا ادارہ'' لاہور سے پہلی بار شائع ہوا ۔ اس مجموعے میں کل ۱۵ افسانے شامل ہیں ۔ اس مجموعے میں شامل زیادہ تر افسانے عورتوں کے محبت' ایثار اور قربانی کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ ان کہانیوں میں عورت ایک ماں' بہن' بیٹی' بہو اور بیوی کی شکل وصورت میں اپنی زندگی کا چین وسکون' اپنی خوشی' اپنے جذبات واحساسات' جسم وجاں غرض ہر مصیبت میں خود کو ڈال کر دوسروں کو خوشی اور مسرت بہم پہنچاتی رہتی ہیں ۔ یا دوسروں کی زندگی کو کامیاب بناتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ دوسرے افسانے ''ڈریم لینڈ'' میں مصنفہ نے مرد کی مطلب پرستی اور خودغرضی کے واقعات کو کہانی کی شکل میں بیان کیا ہے ساتھ ہی ساتھ عورتوں کی وفاداری اور قربانی کا ذکر بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔

جیلانی بانو نے اپنے زیادہ تر کہانیوں کا موضوع و مواد اپنے اردگرد کے ماحول میں پیش آنے والے حالات و واقعات اور حادثات سے رقم کیا ۔ ان واقعات میں خصوصاً عورتوں کی ذہنی و جذباتی' نفسیاتی' اور سیاسی وسماجی مسائل کو بہت ہی گہرے درد وکرب کے ساتھ تحریروں کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ۔ انھوں نے ،مردوں اور عورتوں کے درمیان باہمی تعلقات' اُن کے آپسی عادات واطوار' جذبات و خیالات اور محسوسات غرض کہ پوری گھریلو زندگی کے متنوع مسائل کی عکاسی اپنے افسانوں میں پیش کی ۔ ان کے زیادہ تر افسانوں کے موضوعات معاشرے میں رہنے والی عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم اور جبر واستبداد کے واقعات نمایاں طور پر عیاں ہیں۔

ان کے یہاں روز بروز فکر میں وسعت' شعور کی گہرائی اور فن میں پختگی آتی گئی جس کی بنا پر ان کی نظر اور قلم کی نوک باریک سے باریک تر ہوتی گئی ۔ جیلانی بانو کی افسانہ نگاری کے حوالے

سے ڈاکٹر انور سعید نے اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا:

''جیلانی بانو کا شمار اردو کے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے' جنھیں اپنے پہلے افسانے کی اشاعت پر ہی شہرت مل گئی تھی اور ناقدین فن نے جنھیں صف اول کے افسانہ نگاروں میں معزز مقام عطا کر دیا تھا۔ جیلانی بانو کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے مسلسل اچھے افسانے لکھ کر نہ صرف اپنی شہرت اور مقام کو قائم رکھا بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ اپنے فن کی اساس پر وہ اس مقام کی جائز حق دار تھیں اور نقاد ادب نے انھیں رعایتی نمبر دے کر غلط بخشی کا ارتکاب نہیں کیا'' (جیلانی بانو کے افسانے' انور سدید' ص ۱۔۲)

دوسرا افسانوی مجموعہ ''نروان'' کے نام سے ۱۹۶۳ میں دہلی سے شائع ہوا جس میں کل ۱۴ افسانے شامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل کہانیوں کے زیادہ تر موضوعات غریبی' مفلسی 'اور نسوانی مسائل پر مبنی ہیں۔ ''نروان'' نام کے افسانہ میں مصنفہ نے ہندوؤں کے مشہور تہوار دسہرہ کے پیش نظر غریبوں کی بے بسی' لاچاری کے ساتھ ساتھ مذہب وملت کے نام پر لوٹ کھسوٹ کرنے والے سادھوں' پجاریوں اور پنڈتوں کی مکاریوں اور ان کے ناپاک عزائم اور ناجائز حرکت کرنے والوں پر گہرے انداز میں چوٹ کیا ہیں۔ اسی طرح افسانہ ''دوشالہ'' اور آئینہ'' میں جیلانی بانو نے بوڑھے لوگوں کے نفسیاتی پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے کہ کس طرح بوڑھے لوگ اپنی پرانی یادوں اور چیزوں سے گہرا اور مضبوط لگاؤ رکھتے ہیں۔ ان کی زندگی سے ہمیشہ پرانی یادیں جڑی رہتی ہے اسے نشانی کے طور پر اپنے جان سے بھی زیادہ پیار اور عزیز رکھتے ہیں۔ جب کہ نئی نسل کے لوگوں میں پرانے چیزوں کی نہ کوئی قدر و قیمت رہی' نہ ہی پیار رہا۔

افسانہ ''فصل گل جو یاد آئی'' میں مصنفہ نے غریب عورتوں کی بے کسی و بے بسی اور لاچاری و مجبوری کا تذکرہ کیا ہے کہ ایک عام سی عورت اُس بے جان گڑیا کی طرح ہوتی ہے جس کے پاس نہ دماغ ہوتا نہ روح۔ وہ ہر وقت مرد کی پابند دکھائی دیتی ہے۔ اُسے اس بات کا بھی حق نہیں دیا جاتا کہ وہ زندگی بھر ایک ساتھ گزارنے والے ہمسفر کا انتخاب کر سکیں۔ اسے معاشرے میں غلط کام تصور کیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے نہ جانے کتنے معصوم عورتوں کی زندگی اجیرن بن گئی۔ افسانے کے اہم کردار ''زہرہ'' کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ زہرہ دراصل ایک پڑھے لکھے نوجوان سے شادی کرنا چاہتی تھی یہ خواہش اُس کے دل میں اپنا گھر کر چکی تھی لیکن اپنے والد کے کہنے پر اُس کی شادی ایک امیر گھرانے سے تعلق رکھنے والے ان پڑھ نوجوان سے کی جاتی ہے۔ جہاں زہرہ کو نہ جانے ہر روز کتنے مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑھتا ہے۔ ان کی زندگی میں چاروں اطراف خوشی کے بدلے غم نے جگہ لے لی۔

جیلانی بانو کے بعض افسانوں کا مطالعے کرتے وقت اس بات کا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ ان کے یہاں اکثر و بیشتر افسانوں کے موضوعات نفسیاتی' فرقہ وارانہ فسادات اور ٹوٹتے بکھرتے رشتوں کے موضوع سے متعلق ہیں۔ ان افسانوں میں خاص کر اسکوٹر والا' بھاگو بھاگو اور سونا آنگن'' وغیرہ افسانے کا نام قابل ذکر ہیں۔ افسانہ ''اسکوٹر والا'' میں مصنفہ نے ایک خاص قسم کی نفسیاتی جذبات واحساسات کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ افسانے کا مرکزی کردار ''عابدہ'' نام کی ایک خاتون ہے۔ جو اپنے شوہر اور ایک ننھے سے چھوٹے بچے کے ساتھ ایک محلے میں رہتی ہے جہاں دن شروع ہونے سے لے کر اندھیرا ہونے تک نہ صرف پھیری والے' سبزی والے اور' تانگے والوں کا شور ہوتا ہے بلکہ عورتوں' بچوں اور موٹروں کا بھی شور وغل برابر رات دیر تک رہتا ہے۔ ان ہی لوگوں میں ایک

اسکوٹر والا پڑوسی ایک دن اس محلے سے گزرتا ہے جس سے عابدہ کا چھوٹا بچہ نیند سے بیدار ہو کر ماں کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتا ہے۔عابدہ ایک دن اسکوٹر والا کی آواز سن کر اسے بددعا دینے لگتی ہے کہ خدا کرے یہ اسکوٹر والا مر جائے۔عابدہ کے بددعا کے بعد اُس محلے میں اچانک کسی فرد کی وفات ہو جاتی ہے جس سے سن کر عابدہ خود سے کہنے لگتی ہے کہ اس کی بددعا قبول ہوگئی۔

اسی طرح جیلانی بانو کا ایک اور افسانے ''بھاگو بھاگو'' کے نام سے مشہور ہے جو دراصل فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق ہے۔افسانے کی پوری کہانی ''آشا'' نام کے ایک ہندو لڑکی کے ارد گرد گھومتی ہے۔آشا سلطان نام کے ایک مسلمان لڑکے سے شادی کر لیتی ہے شادی کے بعد ان دونوں کے یہاں دو بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔اچانک پورے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہو جاتے ہیں۔ہر طرف مار دھاڑ، قتل وغارت اور خون ریزی کا عالم چھایا ہوا ہے۔آشا شہر کا یہ منظر دیکھ کر زیادہ پریشان ہو جاتی کہ وہ دو بچوں کو لے کر کس طرف چلی جائیں۔آشا چاروں طرف مایوسی کا عالم دیکھ کر اپنے دو بچوں کے ساتھ شیر کے پنجرے میں گھس کر مطمئن ہو جاتی کہ اب یہاں آ کر اسے کوئی خطرہ نہیں۔

افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''پرایا گھر'' کے نام سے ۱۹۷۹ میں حیدرآباد سے شائع ہوا اس مجموعے میں ۱۲ افسانے شامل ہیں۔اس مجموعے میں زیادہ تر موضوعات نئے دور میں دنیا کی بے حسی، بے ثباتی اور بے چینی کے مسائل پر مبنی ہیں۔آج کے معاشرے میں دولت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے جڑنے والے رشتے درحقیقت ذہنی کشمکش، روحانی آسودگی اور سچی محبت کی تلاش سے مبرا نظر آتے ہیں۔اور خالص دولت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے رشتے استوار رکھتے ہیں۔افسانہ ''پرایا گھر'' میں ان ہی باتوں کا ذکر دیکھنے کو ملتا ہے۔کہ حامد نام کا کردار جب ایک حادثے پیش آنے کی وجہ سے اپنی یادداشت کو کھو دیتا ہے تو اُس کے بیوی بچوں کو اب حقیقت کے انداز میں حامد سے کوئی سروکار نہیں رہتا بلکہ یہ لوگ محض حامد کو پنشن ملنے کی بنیاد پر اُسے رشتہ جوڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''ٹھیک ہے ابا کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا 'امتیاز بھی کمرے سے نکل کر لڑائی میں حصہ لے رہا تھا اچھا خبردار جو انھیں چھوا نمو ہاتھ نچا رہی تھی۔۔۔بڑے آئے ابا سے محبت کرنے والے اپنے ساتھ انہیں لے جا کر سات سو کی پنشن پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔انھیں کوئی اس گھر سے نہیں لے جا سکتا' میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کا یہی تو سہارا ہے'' (جیلانی بانو' تریاق' پرایا گھر' ص ۳۸۷)

افسانہ ''ادو' اور ''تماشہ'' میں جیلانی بانو نے دو طبقوں کی نمائندگی کرنے والوں کا ذکر کیا ہے۔ایک طبقہ امیروں کا ہے جو بے حس' خودغرض' ظالم اور مغرور دولت کے نشے میں ڈوب کر غریب لوگوں پر ظلم واستحصال برپا کرتے ہیں۔دوسرا طبقہ غریب ومظلوم عوام کا ہے جنھیں محنت ومشقت کرنے کے باوجود بھی مناسب اور صحیح معاوضہ وقت پر فراہم نہیں کیا جاتا پھر بھی وہ لوگ سچائی اور ایمان داری کا دامن اپنے ہاتھوں سے نہیں چھوڑتے۔جس کی وجہ سے انہیں ہر روز امیر لوگ مارنے اور ذلیل کرنے پر تلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔دونوں افسانوں میں جیلانی بانو نے سماج میں رائج برائیوں اور تلخ حقیقتوں کی عکاسی نہایت بھرپور انداز میں بیان کی۔

''بہاروں کے بیج'' جیلانی بانو کا ایک بہترین افسانہ تصور کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے غریبوں' کسانوں اور کھیت کھلیانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مظلومی و خستہ حالی کا ذکر نمایاں طور پر کیا ہے وہ غریب اور مزدور طبقے سے

تعلق رکھنے والے لوگ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ ان کی اولادوں کو ان ظالموں نے کیوں مارا اور بعض لوگوں کو بے گھر کر دیا گیا۔ جاگیرداروں اور ساہوکاروں کے کام کو انجام دینے والے یہ مزدور اور کسان خود اپنے دانوں کے لیے محتاج کیوں ہے۔ کیا ان لوگوں کی زندگی اور مقدر میں یہ ظلم وستم ازل سے لکھا ہوا تھا۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''بڈھا تو شاید اس صدمے سے دماغی توازن ہی کھو چکا تھا۔ اسے ایک ہی فکر لگی تھی کہ اس کی بہو ہنسی خوشی اس کے پوتے کو جنم دے۔ بڈھیا اپنی مصیبت سناتے ہوئے ڈرتی تھی۔ ہم بڑی مصیبتوں سے بچ کر شہر آئے ہیں۔ ہم نے کوئی قصور نہیں کیا۔ ہمارے بیٹے نے بھی کوئی خطا نہیں کی تھی۔ نہ معلوم اسے کیوں مار ڈالا، کیوں ہمیں اپنے گھروں سے نکال دیا؟ آگے پوچھنے کی سندتا نے ضرورت بھی نہ سمجھی۔ وہ دن میں ہزار بار اپنے دل سے یہ سوال کرتی تھی۔ ان دنوں بہت سے کسان جان بچانے کے لیے شہر بھاگ آتے تھے۔ مگر شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگنے کے اصول سے واقف نہ ہوتے' اسی لیے جیل بھیج دیے جاتے'' (افسانہ بہاروں کے بیج' تریاق' ص ۱۱۹)

اس افسانے میں مجبور ومقہور زندگی سے مایوس اور تنگ آنے والے کسان بڑھے اور بڈھیا کی زندگی اس بنا پر اپنی زندگیوں کو خوشیوں اور مسرتوں سے بھر دیتے ہیں کہ جو کام ہم سے نہ ہوسکا وہ ہمارے بعد آنے والے ہمارے پوتے ادا کریں گے۔ افسانوں کے علاوہ مصنفہ نے تین ناولٹ بھی تحریر کیے ہیں جو اس طرح سے ہیں۔ ۱۔ نغمے کا سفر ۲۔ جگنو اور تارے ۳۔ رات کے عنوان سے شائع ہوئے۔

جیلانی بانو نے افسانے اور ناولٹ کے علاوہ اردو ادب میں دو مشہور ناول بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''ایوان غزل'' کے نام ۱۹۷۶ میں دہلی سے شائع ہوئی۔ مصنفہ نے اس ناول کو اپنے اکلوتے بیٹے فرحان کے نام منسوب کیا ہے۔ اس ناول کا ترجمہ کئی زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ اس ناول کا بنیادی موضوع ہندوستان کی آزادی سے قبل یہاں کی سرزمین پر رائج جاگیردارانہ اور ظالمانہ نظام سے متعلق ہے ساتھ ہی مصنفہ نے ریاست حیدرآباد کے زوال اور تہذیب وثقافت کو بڑی ہنرمندی اور بے باک انداز میں بیان کیا۔ ناول میں اُس دور کی ادبی' سیاسی' سماجی' معاشی اور ثقافتی زندگی کا ہر پہلو تمام حقیقتوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اس ناول میں تانیثیت کے عنصر بھی نمایاں ہے۔ عمومی طور پر ناول میں تین خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔ پہلا خاندان واحد حسین اور احمد حسین کے کرداروں پر مبنی ہیں۔ دوسرا خاندان واحد حسین کی چھوٹی بیٹی بتول بیگم کا گھرانہ ہے تیسرا خاندان واحد حسین کی بڑی بیٹی بشیر بیگم کے شوہر حیدر علی خان کا ہیں۔ الغرض پورے ناول میں مصنفہ نے عورتوں کے مسائل' ان پر ہونے والے ظلم وستم کی روداد' نفسیاتی وسماجی اور جسمانی طرز پر ہونے والے استحصال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ وہ عورت چاہیے اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھتی ہو یا ادنیٰ طبقے سے وابستہ ہو ان عورتوں پر کبھی روایتی اور مغربی پیرائے میں تو کبھی مذہب کے فرسودہ رسم ورواج کی شکل میں ان پر استحصال کیا گیا ہیں۔ جیلانی بانو نے ناول ''ایوان غزل'' کے بارے میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا:

''اس ناول کو میں نے ایک شدید درد وکرب جیسی کیفیت سے شروع کیا تھا۔ کیونکہ اس کا موضوع میرے ذہن پر ایک بوجھ بنا رکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ اس بکھرتے ٹوٹتے حیدرآباد کا سارا درد کسی طرح اپنی تحریر میں سمیٹ لوں تاکہ یہ ایک خواب کی طرح دماغ سے محو نہ ہوجائے اس کے ساتھ یہ بھی چاہتی تھی کہ ایک مخصوص تہذیب کے زوال پذیر ہونے کے جو

محرکات تھے ان کو محسوس کر سکوں۔اس کے لیے مجھے ان بدلتے ہوئے حالات کے عوامل تلاش کرنا تھے اس اخلاقی اور معاشی زوال کے اسباب بھی دیکھنا تھے۔جو حیدرآباد کی سماجی زندگی میں شروع ہوا تھا۔اسی لیے مجھے ناول میں ماضی کو پیش کرنا پڑا تا کہ میں ماضی کے سہارے حال اور مستقبل کے امکانات کو موضو ع بنا سکوں''

(جیلانی بانو سے ایک گفتگو' رسالہ عصری ادب' مئی تا اگست ۱۹۷۷' ص۲۰)

جیلانی بانو کا دوسرا ناول '' بارش سنگ'' کے عنوان سے حیدرآباد سے ۱۹۸۵ میں پہلی بار شائع ہوئی۔بارش سنگ بھی جیلانی بانو کا ایک سیاسی وسماجی اور تہذیبی ناول ہے جس میں انھوں نے طبقاتی فرق' سماجی ناانصافی' جاگیردارانہ نظام کی خرابیاں اور عیاشیوں کا ذکر کیا ہے مصنفہ نے اس ناول میں غریبوں' مظلوموں اور کسانوں پر پورے ہندوستان میں ہونے والے ظلم وستم کا ذکر نہایت ہی درد بھرے لہجے میں بیان کیا ہے ۔ناول کی شروعات فیض احمد فیض جیسے مشہور ترقی پسند شاعر کے نظم '' آج کے نام اور آج کے غم کے نام'' سے ہوتی ہیں۔یہ ناول بھی دو خاندانوں پر مبنی ہیں پہلا خاندان وینکٹ ریڈی اور ان کے چھوٹے بھائی ملیشم ریڈی کا ہے جب کہ دوسرا رہن مزدور مستان کا ہیں۔اس ناول میں بھی عورتوں کے ساتھ نا انصافی اور ہونے والے ظلم وستم کے پہلو کو اجاگر کیا گیا۔گویا آزادی سے قبل جو کسانوں اور مزدوروں کی حالت تھی آزادی ملنے کے بعد بھی اس میں کوئی قابل نمایاں تبدیلی نہیں دیکھنے کو ملی ۔جیلانی بانو اس ناول سے متعلق لکھتی ہیں:

میں ''بارش سنگ'' کے لیے گاؤں گاؤں گئی۔کھیت کھلیان کے مزدوروں سے ملی۔ان کے مسائل کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔مجھے مزدوروں سے ملنے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ ان کا بڑے پیمانے پر استحصال ہوتا ہے''(جیلانی بانو کا انٹرویو' روزنامہ عوام' اپریل' مئی ۱۹۹۸' ص ۲)

ان دونوں ناولوں کے موضوعات کو اگر آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات صاف طور پر عیاں ہے کہ یہ مسائل نہ صرف اُس دور میں پیش آتے تھے آج بھی ہندوستان کے ہر خطے میں یہ واقعات رونما ہوتے ہیں۔آج کے معاشرے میں چاند اور غزل کی جگہ جوتی سنگھ اور معصوم آصفیہ لڑکی کا نام دیکھنے کو ملتا ہے۔آج کے دور میں بشیر اور نرسیا کے بدلے دوسرے افراد ناانصافی اور ظلم وستم سے تنگ آکر باغی بن جاتے ہیں۔آج کے اس دور میں بھی مزدوروں' کسانوں اور عورتوں پر استحصال کیا جارہا ہے۔آج کے دور میں بھی رشوت خواری اور بے انصافی کا بازار گرم دکھائی دیتا ہے۔آج کے معاشرے میں بھی ہماری ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت کو تار تار کیا جاتا ہیں۔آج کے دور میں بھی جہیز کی بنیاد پر نہ جانے کتنے معصوم عورتوں کی شادی کو لوگ ٹھکراتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو جیلانی بانو نے بنیادی طور پر اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت پائی۔ان کے افسانوں میں متعدد موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ان کے افسانوں میں ماضی' حال اور مستقبل کے واضح نقوش بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔انھوں نے طبقہ نسواں کی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف پہلوؤں کی بڑی سچی اور تلخ تصویریں بھی پیش کیں۔وہ نئے زمانے کی خواتین کو درپیش مسائل کا ذکر بھی بے باک انداز میں کرتی ہے۔وہ عورتوں کی عظمت' ان کی وفا شعاری' اور ان کے ایثار وقربانی کے مختلف رنگ وروپ کو اجاگر کرنا چاہتی تھیں۔ان کے تحریروں میں ریاستی لب ولہجہ اور دکنی الفاظ بھی نمایاں طور پر ملتے ہے

(بقیہ ص:۴۲ پر).....

افشاں جبین۔حیدرآباد

رہبر

اخبار کی اس عبارت نے اس کو ماضی کی ان یادوں کا آئینہ دکھایا۔وہ اپنی زندگی سے مکمل طور پر خوش نہیں ہے کیوں کے وہ اپنے اندر سے اپنے ماضی کی ان ناخوشگوار واقعات کو کبھی نہیں بھول سکتا کیوں کے اس کی زندگی پر ان واقعات نے بہت گہرے اثرات ڈالے۔اس کی زندگی آج بہتر ہے لیکن اس کو حاصل کرنے اور بہترین بنانے کے لیے اس نے اپنے آپ میں بہت ساری تبدیلیاں لائیں۔۔۔ایک ایسا بھی وقت تھا جب اس کو اپنے اللہ تعالی سے اور اپنے آپ سے کئی طرح کے گلے اور شکوے تھے۔کہ اس نے اپنے اس بندے کو کیوں پیدا کیا ہے۔۔ اس دنیا میں اس کو کیوں سب کے ہوتے ہوئے بھی تنہا کردیا۔اس کی زندگی میں کیوں اتنی مشکلات ہیں۔۔کیا اس کی زندگی بھی کبھی ایک پرسکون اور خوشیوں سے بھری مکمل زندگی ہوگی؟ جب اس نے اپنے ماضی میں کچھ اور آگے جا کر دیکھا تو اس کو اس کی وجہ اب معلوم ہوئی کہ کسی انسان پر اس کے بچپن کے واقعات کا کتنا زیادہ اثر ہوتا ہے ان واقعات نے اس کی تمام زندگی پر اثر ڈالا۔اور آج تک جبکہ وہ اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ہے تب اس بات کا اندازہ ہوا کہ اپنی زندگی میں ہر کسی کو ایک ایسے انسان یا پھر رہبر کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو صحیح راستہ بتلائے۔۔۔۔جب وہ اپنی عمر کی پہلی منزل پر قدم رکھتا ہے تو اس کو ایک پیار کرنے والے اور اس کی خوبیوں اور خامیوں کو جان کر اس کو دور کرنے میں اس کا ساتھ دینے کے لیے ایک استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔اس کی زندگی کو ایک مقصد دیتا ہے اگر استاد کا تصور پہلی منزل پر ہی اچھا نہیں ہے تو اس بچے کی زندگی میں آگے کا سفر بہت مشکل ہوجاتا ہے۔وہ اپنی تمام صلاحیتوں کا اظہار اچھے انداز سے نہیں کرسکتا ہے۔۔۔۔۔اسکے ساتھ بھی کچھ اسی طرح ہوا تھا۔بچپن میں اس نے کبھی اپنے اسکول کے دوسرے استادوں نے ڈانٹا تک نہیں تھا صرف ایک استاد کو چھوڑ کر کیا بچپن میں کس بچے سے پڑھنے لکھنے میں غلطی نہیں ہوتی ہیں اس سے بھی ہوتی تھی،غلطیاں مگر اس کو دور کرنے کی جگہ اس کا اشتہار بنایا گیا اور ہر ایک کے سامنے اس طرح پیش کیا گیا کہ اس کی خوداعتمادی ختم ہوتی گئی یہ سلسلہ تمام اسکولی زندگی تک چلتا رہا،جس کی وجہ سے اسکی خوداعتمادی بالکل ختم ہوگئی تھی۔مگر اس نے ان یادوں کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر جاری رکھا۔کالج میں داخلہ کے بعد ایک استاد کی شفقت ومحبت اور حوصلہ افزائی نے اس کی خوداعتمادی کو بیدار کیا اور اس نے اپنی صلاحیت کے جوہر دکھانے شروع کیے اور آج وہ ایک قابل اور کامیاب انسان ہے۔اور آگے کے سفر میں اس کو یہ بات معلوم ہوئی کہ استاد کیا ہوتا ہے اور کس طرح ایک آدمی کو ایک مکمل اور کامیاب انسان بناتا ہے۔ ایک ایسے بچے کو جو استاد کے نام سے بھی ڈرتا ہے اس کو بتلاتا ہے کہ سب کا سوچ، خیالات اور رویئے ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں ہے اور ہر کوئی اسی طرح کا نہیں ہوتا ہے جس طرح کا اس کو تجربہ ہوا ہے لیکن وہ ابھی بھی ڈرتا ہے کے اگر کسی بچے کی زندگی کا پہلا دور اس طرح کا ہوگا جیسے اس کا تھا تو کیا اس کی زندگی آسان ہوگی؟۔ ہر کسی کو دوسرا موقع نہیں ملتا ہے کیا وہ بھی اپنی سوچ کو تبدیل کرسکتا ہے؟ جیسے اس نے کیا آج وہ ایک پڑھا لکھا اور کامیاب انسان ہے مگر وہ آج بھی پریشان ہے کہ اگر آج بھی کسی بچے کی زندگی اس طرح کی ہوئی تو کیا وہ ان یادوں سے نکل سکتا ہے؟۔۔۔کیا آج بھی کوئی رہبر،رہنما یا استاد ہے جو کسی کو ان اندھیروں میں ڈوبنے سے بچاسکتا ہے؟

مگر اس کو ان تلخ یادو سے باہر نکلنے میں اس کی مدد ایک استاد نے کی اور اس کے اس تصور کو غلط ثابت کیا جو ایک استاد کے متعلق اس ذہن پر نقش ہوچکا تھا۔

(بقیہ ص:۴۰ر کا).....

الغرض جیلانی بانو کی ادبی تخلیقات کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی انداز لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ اپنے فکشن میں غریب عوام اور مظلوم طبقے کے مسائل کو ابھارنے کی کوشش کی۔خواہ وہ آزادی سے قبل کا جاگیردارانہ نظام ہو یا دور حاضر کی جمہوری حکومت وہ تمام معاشرتی وسماجی مسائل تھے جو ماضی کے دور میں گزر چکے تھے۔بلکہ آج کے دور میں پیش آنے والے واقعات کی شکل وصورت میں تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے۔جیلانی بانو کی تحریروں میں یہ موضوعات صاف طور پر دکھائی دیتے ہیں۔جہاں ایک طرف جاگیردارانہ نظام'اس کے عروج وزوال اور قدر و قیمت کو بتایا گیا وہیں دوسری جانب موجودہ دور کی سیاسی خود غرضی'دن بہ دن اسکے بدلتے ہوئے مکروہ چہرے'خونی مناظر اور فرقہ وارانہ فسادات کو پیش کیا ہیں۔انھوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات وواقعات اوران سے پیدا شدہ مسائل سے دور چار ہورہے انسانی زندگی کی پریشانیوں 'الجھنوں اور درد وکرب کے واقعات کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ فکشن کے تحریروں کے ذریعے قارئین کا ذہن راغب کرنے کی کوشش کی۔۔ان ہی خصوصیات کی بنا پر جیلانی بانو کا شمار اردو فکشن کے ضمن میں ہمیشہ تابناک رہے گا۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning:11:00 am to 2:30 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدر آباد

زیر انتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدر آباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔موبائل:9392533661